مجھے بولنے دو

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

سچ بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ اور اگر تمہیں سچائی کا علم ہو تو اسے اپنے تک نہ روکے رکھو۔

البقرہ رکوع ۲

کدمت مارسنہ کمار اکشی

سمار
15/6/83

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ شَيْطَانٍ جَائِرٍ (الحدیث)

ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے افضل جہاد ہے۔

کتاب الامارۃ والقضاء مشکوٰۃ شریف

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے بولنے دو

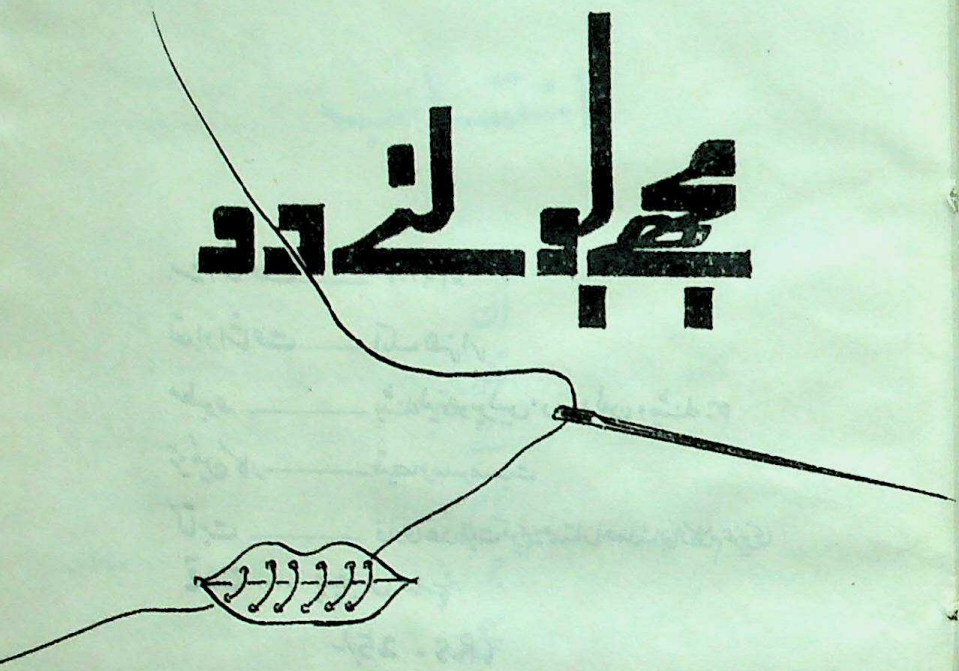

رضوان احمد

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

(جملہ حقوق اشاعت بحق مصنف محفوظ ہیں)

سنہ اشاعت ـــــ ۱۹۸۲ء

تعداد اشاعت ـــــ ایک ہزار

مطبوعہ ـــــ پٹنہ لیتھو پریس، رمنہ لین، پٹنہ ۴

تزئین کار ـــــ قیصر سرمست

کتابت ـــــ قاری ہدایت کریم، ممتاز احمد، ابوالکلام عزیزی

قیمت .... پچیس روپے

(RS - 25/-)

ناشر

زیور پبلی کیشنز، باقر گنج، پٹنہ ۴ ۸۰۰۰۰

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انتساب

اُن
لوگوں
کے
نام
جو
سچ
بولنا
چاہتے
ہیں

★

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مصنّف ایک نظر میں

پورا نام : رضوان احمد خاں ۔

قلمی نام : رضوان احمد ۔

والد کا نام : مشتاق احمد خاں غبار بھٹی ۔

پیدائش : ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء

وطن مالوف : موئی ، بارہ بنکی (یوپی)

تعلیم : ایم ۔ اے (اردو) پٹنہ یونیورسٹی ۔

پیشہ : صحافت ۔

کتابیں : یونان کی شہزادی (۱۹۶۴ء) مسدود راہوں کے مسافر (۱۹۷۷ء)
بادل چھٹ گئے (ترجمہ ۱۹۷۹ء) فصیل شب (۱۹۸۲ء) ۔

انعامات : یوپی اُردو اکادمی سے 'مسدود راہوں کے مسافر' اور 'بادل چھٹ گئے' پر انعام ۔

صحافتی مصروفیات : آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کے تنظیمی سکریٹری ۱۹۷۶ء ۔
آل انڈیا ایڈیٹرس کانفرنس اور آل انڈیا اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرس ایسوسی ایشن کے رکن ، متعدد یونیورسٹیوں میں صحافت کے موضوع پر لکچر دئے ۔

موجودہ پتہ : مدیر اعلیٰ روزنامہ عظیم آباد اکسپریس
پوسٹ بکس نمبر ۱۲ بانکی پور ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عرضِ ناشر

کسی بھی اخبار میں اداریئے وقتی واقعات وحادثات سے متاثر ہو کر لکھے جاتے ہیں اور ان کا تاثر بھی وقتی ہوتا ہے۔ مگر رضوان احمد کے اداریوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کا تاثر وقتی نہیں ہے۔ ان کی ایک مستقل حیثیت ہے اسی وجہ سے بارہا ان اداریوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے ارادے کو بہت تاخیر سے عملی جامہ پہنا سکے۔ اداریوں کا یہ مجموعہ گذشتہ آٹھ برسوں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ تین چار سو اداریوں میں سے دو درجن اداریوں کا انتخاب کرنا ایک مشکل کام تھا۔ ان میں سے بیشتر اداریئے عظیم آباد اکسپریس کے علاوہ ملک کے مختلف موقر اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس سال اُردو صحافت نے اپنی زندگی کے ۱۶۰ سال مکمل کر لیے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس سال اپنے قارئین کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کر رہے ہیں جو اردو صحافت کی اعلیٰ وارفع خدمات کو ادنیٰ سا خراج ہے۔ اخبار کے اجزائے ترکیبی میں بنیادی جزو اداریہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اخبارات تو بہت ہیں مگر ان میں قابل ذکر اداریئے کتنوں کے ہوتے ہیں؟ اخبارات تو بہت ہیں مگر ان میں صاحب قلم کتنے ہیں اور صاحبانِ علم

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تو عنقا ہیں ۔ ایسے میں کیا یہ کم اہم بات ہے کہ مختصر وقت میں 'عظیم آباد اکسپریس' نے اُردو کی صحافتی دنیا میں نہ صرف اپنا مقام بنایا بلکہ اس کے اداریوں نے ایک نئی طرح کی بنا ڈالی ۔

انہیں الفاظ کے ساتھ ہم اداریوں کا انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ۔

ناشر

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

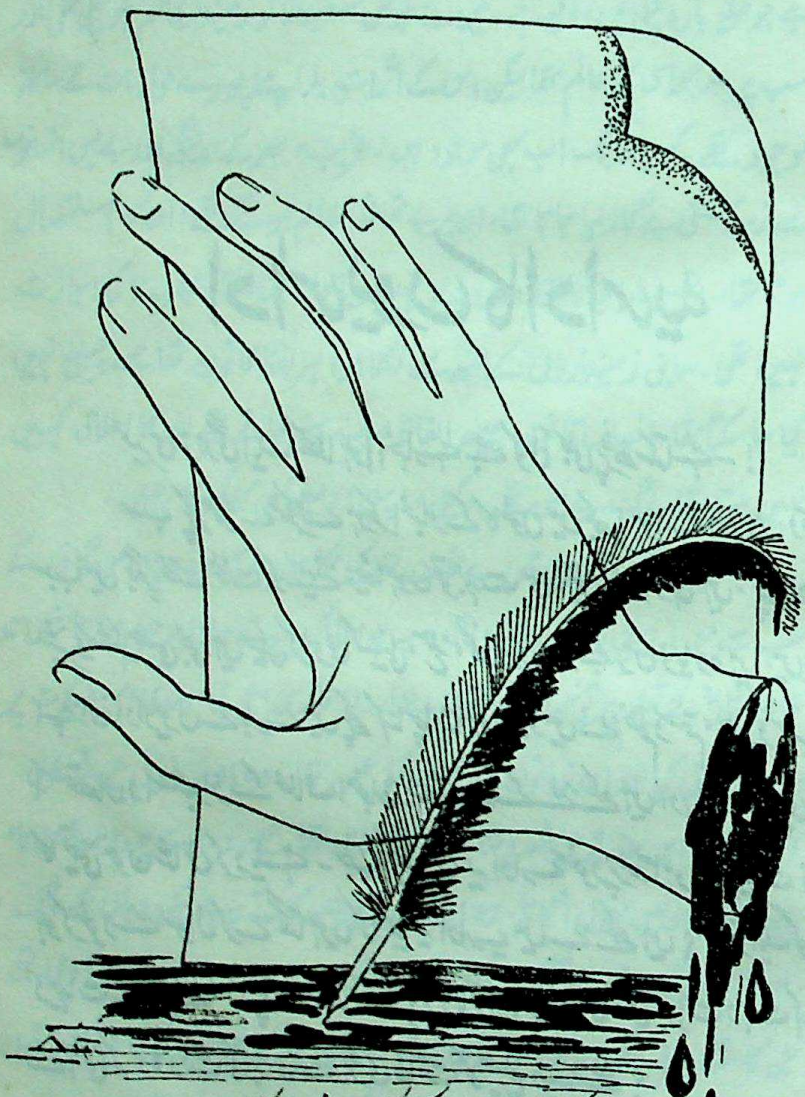

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
(غالب)

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اداریوں کا اداریہ

میری زندگی ایک کھلا ہوا اخبار ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔!

سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اخبار کے کالموں میں بکھرا ہوا ہے اور اس وقت جب میں جگرِ لخت لخت کو سمیٹنے بیٹھا ہوں تو بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ کچھ یادیں شیر و شکر جیسی بھی ہیں لیکن کڑوی کسیلی، تلخ، کھردری اور بے رس زیادہ ہیں۔ میں یہاں اپنے ان اداریوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو میں نے ظلم و ستم، جور و جبر، استحصال و استبداد کے خلاف احتجاج بلند کرنے کے لئے لکھے ہیں اور ان میں اپنی رگوں کا قیمتی خون شامل کر دیا ہے۔ جب کبھی میں یہ اداریے خود پڑھتا ہوں تو حیرت زدہ ہو کر خود سے سوال کرنے لگتا ہوں کہ "کیا یہ اداریے میں نے لکھے ہیں؟" آخر ایک کوردہ دیہات کے شرمیلے، ڈرپوک، دبّو، کمزور و ناتواں لڑکے میں اتنی جرأت و ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ وقت کی بڑی سے بڑی طاقت کو چیلنج دے سکے؟

آج جب میں اپنے ان اداریوں کا پس منظر بیان کرنا چاہتا ہوں تو بچپن سے لیکر اب تک کے تمام واقعات میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح چل رہے ہیں۔ اور یہ کہانی بہت طویل ہے جس کے کچھ واقعات کو میں تحریر کی گرفت میں لینا چاہتا ہوں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میرا آبائی وطن اتر پردیش کا ایک بہت ہی پسماندہ اور کوردہ گاؤں مولیٰ ہے جو ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو زمینداری ختم ہو چکی تھی اور سب پر بدحواسی کا عالم تھا لیکن اس کے اثراتِ بد اپنے پورے لوازمات کے ساتھ موجود تھے۔ کسی حد تک اب بھی موجود ہیں۔ غریب، بھوکے، ننگے اور بے بس انسانوں سے زبردستی بے گار لیا جاتا تھا۔ ان پر بے تحاشہ مظالم ہوتے تھے، ان کا استحصال ہوتا تھا۔ انہیں مارا جاتا تھا اور رونے نہیں دیا جاتا تھا۔ آہ بھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سابق زمینداروں کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انصاف قانون جیسے الفاظ صرف سنے جاتے تھے ان کا اطلاق کہیں نہیں ہوتا تھا۔ لوگ بے بس تھے۔ وکیل، اپیل، دلیل کسی کا کچھ کام نہیں۔

میرے گھر کا ماحول قدرے مختلف تھا کیونکہ میرے آبا و اجداد اس گاؤں کے سب سے معمولی زمیندار تھے اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میرے دادا مرحوم مولانا نثار احمد خان نثارؔ نے تعلیم پر توجہ دی۔ انھوں نے اردو، فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت پر درک حاصل کیا اور ان زبانوں پر انہیں مکمل عبور تھا۔ وہ ان زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اس علاقے میں شعر و شاعری کرنا ایسا ہی تھا جیسے ویرانے میں چراغ جلانا، جیسے ریگستان میں پھول اگانا۔ وہ ادب کی پرورش کرتے رہے لیکن وہاں کے لوگ اس کی قدر و قیمت نہیں جان سکے۔ پورے گاؤں بلکہ قرب و جوار میں وہ واحد آدمی تھے جن کا مشغلہ صرف لکھنا پڑھنا اور پڑھانا تھا۔ ان کا بیشتر کلام ناقدری زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ انھوں نے لاتعداد نظمیں، غزلیں، نعتیں، نوحے، مرثیے، قطعات، رباعیات لکھیں۔ اس طرح شعر و شاعری میری گھٹی میں پڑی تھی۔ سردیوں میں صبح اور رات کو سوکھی لکڑیوں کا الاؤ جلتا تھا جس کے گرد بیٹھ کر مختلف موضوعات پر لوگ گپ شپ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کرتے تھے۔ چونکہ دادا مرحوم گاؤں کے پردھان بھی تھے اس لئے مختلف قسم کے لوگ ان کے پاس اپنا دکھڑا لیکر آتے تھے۔ میں ان دنوں الاؤ کے پاس بیٹھ کر کچھ نظموں کا ورد کیا کرتا تھا جو انھوں نے مجھے لکھ کر دی تھیں۔ وہ نظمیں بڑی سادہ اور سلیس زبان میں تھیں۔ ان کے کچھ اشعار اب بھی یاد ہیں۔

اے مرے مولا اے مرے داتا ؛ تجھ سے ہے ہم سب کا ناتا
تو ہی مارے تو ہی جلائے ؛ تو ہی سب کے آڑے آئے
ڈوبے تروں کا تیرا سہارا ؛ ٹوٹی ناؤ کا کھیون ہارا

ایک دوسری نظم تھی

صبح ہوئی ہے بچو جاگو ؛ نامِ خدا لو کام میں لاگو
پورب سے وہ سورج نکلا ؛ لال بھبھوکا اور چمکیلا
مسجد میں گونجی ہیں اذانیں ؛ مندر میں ناقوس کی تانیں

میں جب یہ نظمیں پڑھتا تو لوگ انہیں غور سے سنتے تھے اور داد بھی دیتے جاتے تھے انہیں دنوں ایک شام ہم لوگ الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ کئی اشخاص سامنے کے راستے سے لاٹھیاں لئے بھاگتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ گوہار آئی تھی اور جنگ بہادر خان مار ڈالے گئے لوگ بھاگے جا رہے ہیں۔ جنگ بہادر خان رشتے میں میرے نانا ہوتے تھے۔ میری عمر اس وقت مشکل سے پانچ سال رہی ہوگی جب میں نے ان کی لاش دیکھی تھی مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ اف! ان کی لاش۔ بے پناہ زخم تھے پورا جسم بلموں سے چھید ڈالا گیا تھا اور ان کی ٹوپی سر میں گھس گئی تھی مغز باہر نکل آیا تھا۔ لیکن یہ اس علاقے کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لڑائی دنگا قتل و خون وہاں کا معمول تھا۔ انسانی جان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آئے دن خوں ریزی کے واقعات ہوتے تھے۔ لاشیں لئے ہوئے لوگ تھانے آتے۔ پوسٹ مارٹم ہوتا۔ مقدمہ چلتا اور لوگ چھوٹ جاتے۔ بس ـــــ درحقیقت وہاں کے نام نہاد رئیس عادی مجرم بن چکے تھے۔ سفید پوش، سماجی طور پر باعزت لیکن جرائم پیشہ۔ سلطان کی اس پورے علاقے پر دھاک تھی۔ ان کا نام لینے سے بچے ڈر جاتے تھے قرب و جوار میں ان کے نام سے لوگ تھر تھر کانپتے تھے۔ ان کے پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔ لیکن ان کا انجام بھی یہی ہوا کہ خود ان کے اپنے ہی لوگوں نے انہیں ختم کر دیا۔ وہی لوگ جو ان کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہ کرتے تھے۔

ان واقعات نے جنگ و جدال قتل و غارت گری کے خلاف میرے دل میں نفرت پیدا کر دی۔

میرے نانا جان مرحوم صادق حسین خان اس پورے علاقے کا جیتا جاگتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اک ذرا چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ سب بیان کر جاتے تھے۔ اس سارے علاقے کی تاریخ کے بارے میں انہیں سے معلوم ہوا۔ وہ بھی فطرتاً بڑے جنگجو تھے اور جنگ و جدال کی باتوں سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔ جنگ بلقان، جنگ یرموک وغیرہ کی تواریخ خاص طور پر پڑھا کرتے تھے۔ تاریخی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بہت ہی نڈر بے باک، غیور اور خود دار تھے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد بہت تکلیفیں اٹھائیں لیکن کسی کے سامنے اپنا دکھ بیان نہیں کیا۔ خود داری اور استغنا کا سبق میں نے انہیں سے پڑھا۔ انھوں نے بھی بڑی جنگیں لڑی تھیں زندگی عجیب نشیب و فراز سے گذری تھی۔ اس کی گواہی ان کا گھٹا ہوا سر ہی دیتا رہتا تھا جس پر اس پار سے اس پار تک ایک لمبی لکیر تھی۔ جس کے بارے میں وہ بتلاتے رہتے تھے کہ ان کے سر پر لاٹھی پڑی تھی تو پورا سر کھل گیا تھا اور لوگ انہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے لیکن بعد میں انہیں گھر لایا گیا تو پتہ چلا کہ وہ زندہ ہیں۔ اس واقعے کے کم از کم پچیس سال بعد تک وہ زندہ رہے لیکن اس کا نشان مرتے دم تک ان کے سر پر رہا۔ وہ عجیب انسان تھے۔ بے حد سخت۔ اصول کی بات آجائے تو چٹان سے بھی زیادہ سخت۔ جو عہد کر لیا اسے زندگی بھر نہیں توڑا۔ لیکن بچوں کے معاملے میں بے حد رقیق القلب تھے۔ ہم سب بھائی بہنوں سے انھوں نے ٹوٹ کر محبت کی اور پرورش کی۔ کوئی بچہ کسی چیز کی فرمائش کر دے تو کیا مجال کہ اسے کسی طور پر پورا نہ کریں۔ ان کے لگاتار آٹھ بچے ہوئے اور سب کے سب ختم ہو گئے۔ کوئی ان میں زندہ نہ رہا۔ شائد یہی وجہ تھی کہ وہ بچوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس پورے علاقے کی تاریخ اور جغرافیے کے بارے میں مجھے انھوں نے ہی سب کچھ بتایا تھا۔

میرا تعلق بھٹی خانوادے سے ہے جنہیں مسلم راجپوت بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ہمیشہ ہی بہت جنگجو قوم رہی ہے اس لئے اس کو تعلیم سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ تعلیم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخ کبھی مرتب نہیں ہو سکی۔ اس کی تاریخ کے اوراق جنگ و جدال کی نذر ہوتے رہے اور خون سے تر ہوتے رہے۔

مجھے تاریخ سے کوئی خاص شغف نہیں اسی لئے میں اپنے خانوادے کی تاریخ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا بلکہ یہ کہوں کہ میں نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جہاں تک مجھے علم ہے کہ ہندوستان میں بھٹی قوم کی کوئی مستند تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ پاکستان میں اس موضوع پر کچھ خاص کام ہوا ہو کیونکہ وہاں بھٹی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور خاصے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ مجھے بچپن ہی میں یہ معلوم ہوا تھا کہ میرے خانوادے کا تعلق ہندوؤں کے 'چندر ونشی' خاندان سے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے جو کہ ریاست بھٹینر (راجستھان) سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس سلسلہ کی زیادہ تفصیل مجھے معلوم نہیں ہے خاندان کے بزرگوں سے سنا تھا کہ تقریباً ۱۴۰۰ء میں بھیرو نام کے راجہ مسلمان ہوئے تھے راجپوتوں کے یدرو نشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کی حکومت سندھ کے علاقہ بھٹینر میں تھی انہیں کے خاندان کے ایک فرد تاتار خان کے ہمراہ قوم 'بھر' کی سرکوبی کیلئے ایک فوج کی قیادت کرتے ہوئے پرگنہ لبھوڑ ہی میں آئے تھے۔ 'بھر' وہاں کی بڑی ہی ظالم و جابر قوم تھی جو عوام کا استحصال کرتی تھی اور اس نے اپنے خزانے بھر لئے تھے۔ بھٹیوں نے 'بھروں' کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا اور ان علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اس فتح کے بعد یہ علاقے امام زہد خان بھٹی کو ملے تھے جن سے ان کی نسل آگے چلی۔ روایت ہے کہ بھٹیوں کو یہ کامیابی ایک بزرگ شاہ جلال بے نوا کی دعاؤں سے حاصل ہوئی تھی۔ جنہیں 'بھروں' نے تنگ کر رکھا تھا۔ ان کی بددعاؤں کے باعث ہی 'بھر' قوم ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

بھروں کے خزانے کا قصہ بھی عجیب ہے۔

بھٹی قوم نے ان کے سب سے اہم قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ یہ عظیم الشان قلعہ امراؤ پور میں واقع تھا جو کہ تقریباً پچھتر بیگھہ کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ آج بھی اس قلعے کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ ۱۵۴۰ء میں اس پر بھٹیوں کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن بھروں کا وہ عظیم الشان خزانہ بہت ہی تلاش کے باوجود ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا جس کی الف لیلوی کہانیاں مشہور تھیں۔

اس سلسلہ میں بہت اہم واقعہ ۱۸۹۰ء میں سردار وزیر علی خان بھٹی کے دور میں پیش آیا۔ سردار کو علم نجوم سے بہت شغف تھا۔ انھوں نے اپنے علم اور

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جوتشیوں سے پتہ چلوایا کہ امراؤ پور میں سونے چاندی کی اینٹوں کا خزانہ کہاں پوشیدہ ہے۔ جوتشیوں نے بتایا کہ یہ بیش بہا خزانہ پچاس سونے چاندی کی بڑی بڑی دیگوں میں بند ہے اور ان کی نگرانی کا کام کئی سو بدروحوں کے سپرد ہے جن کو بھروں نے خزانہ رکھتے وقت انسان کی بلی چڑھائی تھی تاکہ ان کے علاوہ اور کوئی اسے نہ نکال سکے۔ پتہ چلا کہ ان رکھوالی کرنے والوں کے ہزاروں ہزار کے گروہ اجودھیا جی میں رہتے ہیں۔

بدروحوں سے بچاؤ کے منتر ڈھونڈے گئے اور جپ تپ کرنے والے سینکڑوں جوتشی وقت مقررہ پر امراؤ پور پہونچے۔ کھدائی کی نشاندہی کی گئی اور پھاوڑے چلنے لگے۔ پورا علاقہ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے امنڈ آیا۔

ابھی تھوڑی سی ہی کھدائی ہوئی تھی کہ جاپ کرنے والوں نے بتایا کہ اجودھیا جی سے فوج روانہ ہو رہی ہے۔ پھر تھوڑی تھوڑی دیر پر احوال بتلاتے رہے۔ انھوں نے ہوشیار کیا کہ اب محض ایک میل پر فوج ہے۔

پھر اچانک ہی لوگوں نے دیکھا کہ مشرق سے آگ کی طرح ایک سرخ سرخ گولا تیزی سے چکر کھاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ سب لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ جاپ کرنے والے اپنے ہی بنائے ہوئے حصاروں سے نکل کر بھاگے اور چیخ چیخ کر کہا کہ سب لوگ بھاگ چلو اگر اس کی زد میں آگئے تو جان نہیں بچ سکتی یہی نہیں بلکہ جہاں جہاں تمہاری نسل ہوگی وہ سب نیست و نابود ہو جائے گی۔ لوگ جی چھوڑ کر بھاگے۔ کتنے نالوں کھائیوں میں گر کر ختم ہو گئے۔ یہ جیودھاری خزانہ آج تک کسی کو نہیں مل سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ اب بھی امراؤ پور میں دفن ہے اور ہزاروں بدروحیں اس کی حفاظت کر رہی ہیں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گاؤں کے سارے بھٹی، جو سب کے سب زمیندار بھی تھے زمینداری کے خاتمے کے بعد بے حد اداس و دلبرداشتہ بھی تھے اور برہم بھی۔ زمینداری کے خاتمے نے انہیں محتاج بنا کر رکھ دیا تھا کل تک جن کے دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے اب مفلس و کنگال ہو چکے تھے لیکن اکڑ وہی تھی۔ تعلیم حاصل نہیں کریں گے۔ نوکری نہیں کریں گے۔ اپنے ہاتھوں سے کوئی کام نہیں کریں گے۔ اور ان کی یہ جھوٹی انا انہیں اندر سے بالکل کھوکھلا کر رہی تھی۔

میں نے زمینداری کا دور اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے اثرات بد میری نظروں کے سامنے تھے۔ لیکن جس واقعے نے میرے اندر زمینداری، تعلقداری اور جاگیرداری کے خلاف نفرت پیدا کی وہ میرے نانا جان مرحوم نے مجھے سنایا تھا۔ عجیب اتفاق کہ یہ ان کے خاندان کا ہی واقعہ تھا —— ان کے دادا جان مرحوم بڑے سخت مزاج تھے۔ اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حکم عدولی کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زمینداری کے عروج کا زمانہ تھا اور ان کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہوتا تھا۔ ایک بار کسی آسامی نے لگان ادا کرنے میں تاخیر کی تو انھوں نے دونوں میاں بیوی کو لا کر بھیسلے (جس میں بھوسا رکھا جاتا ہے) میں بند کروا دیا اور ان لوگوں نے زیادہ چیخ و پکار کی تو اس میں آگ لگوا دی جس میں وہ زندہ ہی جل کر راکھ ہو گئے۔

وہ کہتے تھے کہ انہیں لوگوں نے مرتے وقت چیخ چیخ کر کہا تھا کہ "ٹھاکر ہم کا تو مارت ہو مگر تمہرے جیاں بھی سنتان نہ ہوئیے"

اس واقعے کا ان کے دادا جان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے تمام مزارات کے چکر کاٹے صوفی سنتوں کی خوشامدیں کر کے اپنے پاپ کا پرائشچت کیا اس کے بعد ہی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ان کی نسل آگے چل سکی۔

یہ واقعہ سناتے سناتے میرے نانا جان آبدیدہ ہو جاتے تھے اور میں اس غیض و غضب کی دنیا میں کھو جاتا تھا جو ایک جہنم سے کم نہ تھی۔ مجھے ان کے مکان کے عالی شان کھنڈروں میں آج بھی ان کی روح سر ٹکراتی نظر آتی اور جیسے اب تک وہ دلدوز چیخیں گونجتی محسوس ہوتیں ـــــ مجھے اس سارے نظام سے نفرت ہوتی چلی گئی۔

میرے گاؤں میں ایک اسلامیہ مکتب تھا جو ایک شخص کی ذات پر چلتا تھا۔ نام تو ان کا یعقوب تھا لیکن انہیں لوگ مولوی چھیدی کہتے تھے۔ وہ مدرسہ کے مولوی بھی تھے اور چیراسی بھی۔ قرآن سے لیکر تمام مضامین وہی پڑھاتے تھے اور دفتری کام بھی کر لیتے تھے۔ رعب ان کا بے پناہ تھا۔ لڑکوں کو بے حد مارتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کوئی ان کے پاس لڑکا پڑھنے کے لئے بھیجے تو ہڈی چمڑا کی طرف سے صبر کر لے۔ روزانہ صبح بانس کی پتلی مضبوط قمچی لاکر تین پائے والی میز پر رکھتے تھے اور جب کسی لڑکے کو مارنا شروع کرتے تھے اگر وہ میز کے نیچے گھس جائے تو پھر پیر چلانا شروع کر دیتے تھے۔ مارتے وقت ان کا جوش دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ایک بار غصے میں انھوں نے ایک لڑکے کو تختی اٹھا کر مار دی تو اس کا سر ہی پھٹ گیا اور پھر تو وہ بدحواس ہو گئے۔ خون دھوتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ ان کے نام سے لڑکوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا اسکول نہ آتا تو دو لڑکے اس کے گھر بھیج کر پکڑ کر بلواتے تھے، جمعہ کا دن لڑکوں کے لئے عید کا دن ہوتا تھا کیونکہ اس روز مکتب بند ہوتا تھا۔ جمعرات کے دن مولوی صاحب اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ ان کا گھر اس گاؤں سے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

قریب آٹھ نو میل دور تھا۔ پیدل جانا ہوتا تھا اس لیے اسکول ختم ہونے سے قبل چلے جاتے تھے۔ لیکن لڑکوں کو ہدایت کر جاتے تھے کہ وقت سے قبل کسی کو نہیں جانا ہے اور کیا مجال کہ چار بجے سے قبل کوئی قدم بھی باہر نکالے۔ وہ نہ ہوں لیکن ان کا خوف غالب رہتا تھا۔ سنیچر کے روز وہ واپس آتے تھے لیکن عموماً گیارہ بارہ بجے تک۔ تو دو تین گھنٹے لڑکوں کو جشن منانے کے مل جاتے۔ پتہ نہ رہتا تھا کہ کس وقت آجائیں گے اس لیے دو تین لڑکوں کی باری باری ڈیوٹی لگادی جاتی کہ گاؤں کے باہر پلیا پر جاکر سامنے کے راستے پر نظر جمائے رہیں کہ مولوی صاحب آتو نہیں رہے ہیں اور جب دور سے ہی مولوی صاحب جھولا لیے آتے ہوئے نظر آتے تو لڑکے دوڑتے ہوئے آتے اور بتاتے کہ مولوی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ بس ساری دھما چوکڑی ختم کر کے سب پڑھنے میں لگ جاتے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور مولوی صاحب کے آتے ہی سناٹا چھا جاتا۔ کئی سال قبل مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا لیکن یہ انہیں کا فیض ہے کہ گاؤں میں کچھ لوگ پڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔

اسی مکتب کی تعلیم کے دوران ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا کہ ایک دولت مند لڑکے نے ایک غریب لڑکے کو مارا وہ چیختا رہا لیکن دولتمند لڑکے کا رعب ایسا غالب تھا کہ کسی نے اس کی مدد نہ کی اور اس روز مجھے سرمایہ داری، نابرابری سے سخت نفرت ہو گئی۔

زمینداری ختم ہونے کے بعد حالت ابتر تو تھی ہی ۱۹۷۵ء میں جو قیامت خیز بارش ہوئی اور سیلاب آیا وہ پورے گاؤں کو بہا کر لے گیا مجھے وہ قیامت خیز بارش آج تک یاد ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں ہم سبھوں کو دربدری اور خانہ بدوشی کی زندگی گذارنی پڑی تھی۔ اس لگاتار قیامت خیز بارش کا سلسلہ دس دنوں تک

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

چلتا رہا تھا۔ رات بھر مکانوں کے گھا گھم گرنے کی خوفناک صدائیں آتی تھیں اور دل لرز کر رہ جاتا تھا۔ کوئی بھی مکان کے اندر نہ سوتا تھا سب چھپّر میں یا ترپال میں سوتے تھے۔ جب بہت بارش ہوتی تھی تو میں ایک مسافر کھلی فضا میں بنا کر گاڑ دیتا تھا۔ مسافر دو تین لکڑیاں باندھ کر اور کپڑے پہنا کر بنا دیا جاتا تھا اور اس کی پیٹھ پر آٹے کی ایک پوٹلی لٹکا دی جاتی تھی ذہن میں تصور یہ تھا کہ ایک مسافر آٹا لیکر گھر جا رہا ہے اور راستے میں اسے بارش نے آگھیرا ہے۔ بھیگتے ہوئے مسافر کو دیکھ کر خدا کو یقیناً رحم آجائے گا اور بارش رک جائے گی۔ میں رات کو اٹھ اٹھ کر دیکھتا کہ خدا کو مسافر پر رحم آیا یا نہیں لیکن بارش رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مسافر مسلسل بھیگ رہا تھا۔ اور دو تین دنوں کے بعد میرے ماموں کو اس قدر غصہ آیا کہ انھوں نے مسافر کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔

"جب پانی نہیں روکت ہے تو ای کے لگائے سے کا فائدہ۔ مار کے پھینکو سسرے کو"

جیسے وہ واقعی کوئی سچ مچ کا مسافر ہو۔

میرے گاؤں کے کنارے کلیانی ندی بہتی ہے جو عام طور پر ایک بے ضرر ندی ہے لیکن پہلی بار یہ بھی خونخوار بن گئی بستی میں گھس آئی۔

ایسے میں جب گاؤں پر ویرانی کا گمان ہوتا تھا کچھ زندہ لوگ بھی تھے جو رات کو تانیں اڑاتے تھے۔

"سن پچیں ماں بہیا کرگے طوفان
یک محلہ گرگے، دو محلہ گرگے
گرگے ہیں کتنے پکے" مکان
سن پچیں ماں بہیا کرگے طوفان

جب سے یہ اجدیا آئی ہے سب
فکر گئی بیباک بھین
بس تن پہ لنگوٹی باقی ہے اب چاک
گریباں کا ہوتے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اس سیلاب سے نقصان جو بھی ہوا ہو لیکن فائدہ یہ ہوا کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد جو سب اپنی کھال میں سمٹ کر رہ گئے تھے ایک دوسرے سے قریب آئے اور ان کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سب ایک ہی دکھ کے مارے ہوئے تھے اس لئے سمجھنے میں دیر بھی نہیں لگی۔ کچھ کام کرنے کا بھی احساس جاگا کیونکہ سیلاب نے انہیں بالکل تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا حالانکہ ہم اس زمانے میں بھی گاتے تھے

گاندھی بابا کے بلہاری اب جمانا بدل گا

ایک جمانا رہے مڈلچی لکھنو پڑھنے جاتے

اب تو ہیں شکچھا کی در در ٹریننگ پاتے۔ گاندھی بابا کے بلہاری

میرے گاؤں میں پرائمری اسکول سے آگے کی پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ پرائمری کے بعد پڑھنے کے لئے دوسرے گاؤں میں ایک جونیئر ہائی اسکول میں جانا ہوتا تھا۔ عام طور پر پرائمری کے بعد لڑکے پڑھائی ختم کر دیتے تھے۔ کیونکہ دوسرے گاؤں جانے کے لئے درمیان میں ایک گھنا جنگل پڑتا تھا جس میں خونخوار جانور بھی تھے۔ ایسی صورت میں میرے دادا کو میری پڑھائی کی فکر ہوئی۔ والد صاحب اس زمانے میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں پٹنہ چلے جا چکے تھے لیکن وہ ان کے لئے بالکل نئی جگہ تھی۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ مجھے میرے بابا مختار احمد (تیس سال قبل ان کا بھی انتقال ہو گیا) کے پاس کانپور بھیج دیا جائے جو کہ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ایک جونیئر ہائی اسکول تھا۔ مجھے بھی وہیں داخلہ مل گیا۔ اس اسکول میں زیادہ تر مزدوروں کے لڑکے پڑھتے تھے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے اپنے محلے کی وہ چوپال بھی نہیں بھولتی جس میں کئی چارپائیاں اور تخت پڑے رہتے تھے اور کئی حقوں کی چلمیں تازہ کی جاتی رہتی تھیں لوگ لیٹے لیٹے انہیں گڑگڑاتے رہتے تھے اور گاؤں کے ایک بزرگ یٰسین خان طلسم ہوشربا باآواز بلند پڑھا کرتے تھے اور لوگ گوش بر آواز ہو جاتے تھے۔ سانسیں بھی آہستہ لیتے تھے تاکہ خلل نہ واقع ہو۔ اس چوپال کا ماحول بڑا خوابناک تھا تمباکو کا اڑتا ہوا خوشبودار دھواں دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر آویزاں جس میں جنگ بلقان کا ایک منظر دکھایا گیا تھا کہ فرانسیسی فوج بھاگ رہی ہے اور ترکی فوج قلعے کی فصیلوں سے گولہ باری کر رہی ہے۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو کر دن و رات اسی چوپال میں طلسم ہوشربا سنتے یا پھر یٰسین بابا کبھی کبھی صادق سردھنوی کی تاریخی کتابیں پڑھتے۔

زمینداری کے خاتمہ کے بعد یہ عجیب و غریب فرار کی کیفیت تھی۔ ان کے اندر جو مایوسی اور شکستگی تھی اس سے فرار کے لئے انھوں نے یہ صورت نکال لی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لوگ افیون کی چسکیاں لیتے تھے۔ جنگ بلقان، قسطنطنیہ اور جانے کون کون سے تاریخی قصے سنتے تھے اور اسلامی فوج کی سربلندی پر سر دھنتے تھے انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ خود ہر محاذ پر ہار چکے ہیں اور ان کے قلعے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ تاریخ پارینہ کے اوراق پلٹتے تھے اور انہیں یہ خیال تک نہیں تھا کہ ان کی اپنی تاریخ جانے کہاں گم ہے جس کے کسی ورق کا پتہ نہیں عجیب عالم تھا۔

جو قوم جری، بہادر، جنگجو تھی اس کو ایک طویل عرصے تک آرام و آسائش نصیب ہوئی لیکن زمینداری ختم ہونے سے سارے شیش محل ٹوٹ گئے آسائش دنوں کی آسائش نے ان کی ہمت توڑ کر رکھ دی جن کے بارے میں کہا جاتا تھا

رگھوکل ریت سدا چلی آئی پران جائے پر وچن نہ جائی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ان کا کردار بھی مجروح ہو گیا تھا۔ ان راجپوتوں کے اجداد جان ہارتے تھے لیکن وچن نہیں ہارتے تھے جو وعدہ کر دیا وہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا اور اس سے کبھی نہیں پھرتے تھے لیکن افسوس کی آسائش نے ان کے کردار کو بھی مسخ کر کے رکھ دیا۔ ان کی پست ہمتی نے ان کا پورا پس منظر دھندلا کر دیا۔

کانپور کا تین سالہ قیام میرے زندگی کا عجیب و غریب حادثہ تھا۔ ایک شہر جس میں ہر جانب دھواں ہی دھواں تھا۔ یہ دھواں کتنوں کے سینے سے اٹھتا تھا اور اس سے بہتوں کے چہرے کالے ہوتے تھے لیکن اس کالک کاروبار کرنے والے سفید پوش لوگ بڑی بڑی بلڈنگوں، بڑی ملوں، کوٹھیوں اور زندگی کی آسائشوں کے مالک تھے۔ میں سڑک پر دوڑتی ہوئی کاریں دیکھ کر سوچتا تھا کہ اس کار کے اندر بیٹھنے والے بھی کیا اسی دنیا کے انسان ہیں؟

کانپور کی بیشتر بستیاں گندی تھیں۔ میں جس علاقے میں رہتا تھا اس میں بھی بیشتر مل مزدور ہی رہتے تھے۔ ان کے لڑکوں سے میری دوستی تھی۔ اس زمانے میں میں نے بہت کچھ سیکھا اور جانا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو کانپور کا قیام میری زندگی کا بہت ہی اہم انقلابی موڑ ہے۔

اس گندی بستی میں بھی اکثر چمچماتی ہوئی موٹریں آتی تھیں۔ کسی مکان کے سامنے رکتیں اور چلی جاتیں۔ رات کے وقت اکثر کاروں کی آمد و رفت ہوتی۔ عورتیں کانا پھوسی کرتیں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ مل مالکوں، ان کے اوباش لڑکوں اور مل کے افسران کے لئے یہ گندی بستی عیاشی کا اڈہ ہے اس کیچڑ میں ان کے لئے کنول کھلتے ہیں جنہیں وہ خواب گاہ میں مسل دیتے ہیں ـــــ ملوں میں کام کی دو شفٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن کی دوسری رات کی۔ مل کا ہیبتناک

بھوپ نیوز بتا تھا اور مل مزدور کام پر چلے جاتے تھے۔ اور رات کی شفٹ کے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مزدوروں کے یہاں یہ اوباش شہزادے جا پہونچتے تھے۔ پھر ان وفادار ملازمین کی ترقی کا حساب کتاب کرتے تھے۔ گاؤں کے معصوم اور محنتی لوگ کتنے حسین سپنے اپنی پلکوں پر سجا کر آتے تھے لیکن اس دھوئیں کے شہر میں انہیں کالک کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا۔ میں نے کانپور میں جتنے اداس چہرے دیکھے اور کہیں نہیں دیکھے۔ دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں، بے جان اور بے رونق چہرے جہاں کے دن بھی کالے ہوتے تھے اور راتیں تو سیاہ ترین لیکن چند لوگوں نے ان کی ساری محنت پر قبضہ کر کے اپنی راتوں کو بھی دن بنا کر رکھا تھا۔ جن کے لئے ہر رات دیوالی اور شب برات تھی اور ہر دن عید کا دن تھا۔ میں اپنی زندگی میں ان ایک ہزار دنوں کو کبھی بھول نہیں سکتا جو میں نے کانپور کی چمنیوں کا دھواں گھونٹ کر گذارے۔ پتہ نہیں میرے پھیپھڑوں پر اس دوران کتنا کاربن جمع ہو گیا ہو گا۔

کانپور کی ہر گلی سے سڑے ہوئے چمڑے کی ایسی بدبو اٹھتی تھی کہ گذرنے والے کو متلیاں آتی تھیں۔ رومال ناک پر نہ رکھ لو تو قے ہو جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان شاندار کوٹھیوں بنگلوں میں اس سے کہیں زیادہ تعفن تھا جہاں اوباش شہزادوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔

اسی نابرابری اور استحصال نے میرے دل میں اس سارے نظام کے خلاف بے اندازہ نفرت بھر دی جسے میں کبھی نہیں نکال سکا۔

میں نے کانپور کے قیام کے دوران ہی اخبار بینی شروع کی۔ اس وقت وہاں دو اردو کے روزنامے شائع ہوتے تھے ان دونوں کے دفتر میرے اسکول کے راستے ہی میں پڑتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہاں جو کچھ بنی نوع انسان پر ظلم ہوتا ہے کیا ان کی نظروں سے نہیں گذرتا ہے کیونکہ اس ظلم کے خلاف ان اخبارات

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں جو جھنجھلاہٹ تھی اس کے اخراج کے لئے میں نے ایک قلمی اخبار 'اصلاح' نکالا۔ تہینے دو مہینے میں اس کا ایک شمارہ مکمل کر لیتا تھا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں وہی باتیں لکھتا تھا جو میرے ذہن کو جھنجھوڑتی رہتی تھیں۔ اور یہ قلمی اخبار میں اپنے اسکول کے دوستوں کو دے دیا کرتا تھا جو اسے باری باری پڑھ کر مجھے پھر واپس کر دیتے تھے۔ میں نے اس کے کوئی چار یا پانچ شمارے نکالے تھے۔ افسوس کہ میرے پاس اس کا کوئی شمارہ نہیں ہے ورنہ میں تقابل کرتا کہ اس کے بعد سے میری صحافتی زبان میں کیا ترقی ہوئی ہے۔

اسی دوران میں نے کچھ نظمیں بھی لکھیں جو میں نے دادا مرحوم کو اصلاح کے لئے دیں لیکن انھوں نے پتہ نہیں کس جذبے کے تحت انہیں والد صاحب کے پاس بھیج دیا جنھوں نے وہ نظمیں تو اصلاح کر کے مجھے بھیج دیں مگر یہ مشورہ دیا کہ میں شاعری کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھا کروں۔ اس زمانے میں، میں نے بچوں کے لئے کچھ کہانیاں لکھیں۔ جو اخبارات میں شائع بھی ہوئیں۔

کانپور کے ماحول نے میرے اندر بہت جھنجھلاہٹ اور برگشتگی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے میں وہاں زیادہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس جذبے کا اظہار جب میں نے دادا جان سے کیا تو انھوں نے مجھے گاؤں واپس بلا لیا۔ میں نے گاؤں واپس آ کر اطمینان کا سانس لیا اور وہ مجھے جنت سے کم نہیں لگا کیونکہ میں جہاں سے آ رہا تھا وہ شہر جہنم کا نمونہ تھا جہاں اپنے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے انسان کو اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑتا تھا۔ اپنے گاؤں میں اس شہر جیسی منافقت نہیں تھی۔ پھر سوال آگے کی تعلیم کا تھا اور یہ بڑا گمبھیر مسئلہ تھا۔ میں اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ سائیکل چلا سکتا تھا۔ میرے گاؤں سے قریب جو ہائی اسکول تھا وہ نو میل کے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فاصلے پر تھا۔ میرے گاؤں سے کچھ اور بھی لڑکے وہاں پڑھنے جاتے تھے کچھ تو پیدل بھی آتے جاتے تھے۔ میرے لئے نئی سائیکل خریدی گئی اور میں نے تین چار مہینوں میں سائیکل چلانی سیکھی۔ میں روزانہ اٹھارہ میل کا سفر کرتا تھا۔ آنے جانے میں دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ عجیب و غریب دن تھے وہ بھی۔ گرمی ہو جاڑا یا برسات روزانہ اٹھارہ میلوں کا سفر کرنا ہوتا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ دس سال سے بھی زائد ہو گئے میں نے سائیکل کی سواری نہیں کی۔ سردیوں میں اتنی دور سائیکل چلانے سے ہی بدن میں گرمی آ جاتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اتنی سخت سردیاں پڑتی تھیں کہ کمبل اوڑھنے کے باوجود سردیاں نہ جاتی تھیں۔ راستے میں پیڑ کٹتے رہتے تھے اور جہاں جہاں ان کی پتلی شاخوں اور سوکھی پتیوں کے ڈھیر ہوتے ہم سب لڑکے جمع ہو کر اسے جلاتے اور تاپ کر گرمی پیدا کرتے یہاں تک کہ پسینہ چھوٹنے لگتا تو پھر سفر شروع کرتے لیکن کتنی دیر تک پھر سردیوں سے کپکپاہٹ طاری ہو جاتی۔

وہ اسکول نیموں کا تھا اس میں چھ سات سو لڑکے پڑھتے جن میں دس بارہ ہی مسلمان تھے میرے کلاس میں صرف دو لڑکے مسلمان تھے۔ صرف ایک مسلمان ٹیچر تھے۔ لیکن کسی قسم کا تعصب نہ تھا۔ کم از کم میرے ساتھ کبھی کسی نے کوئی متعصبانہ برتاؤ نہ کیا۔ البتہ اس اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ دو سال تک میں صرف ہندی سنسکرت پڑھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اردو سے بالکل نابلد سا ہو گیا۔ اسی زمانے میں میری دلچسپی تلسی داس، سورداس، میرابائی کبیر اور رحیم خان خاناں وغیرہ سے پیدا ہوئی۔ تلسی داس کی رام چرتر مانس نے مجھے بہت متاثر کیا اور اس کا بہت حصہ مجھے زبانی یاد ہو گیا۔ اسی زمانے میں، میں نے اکھنڈ رامائن کے پاٹھ میں بھی حصہ لیا تھا۔ ہم لوگوں کے زمانے میں اسکول میں ایک میلاد بھی ہوا تھا۔ اس میں ہندو مسلمان سبھوں نے حصہ لیا تھا۔ اب اس اسکول نے کافی ترقی کر لی ہے اور انٹر کالج بن گیا ہے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں نے یہاں ایک بات ضرور محسوس کی زمیندار یا تعلقدار ہندو ہوں یا مسلمان ان میں کوئی اختلاف نہ تھا چونکہ اس اسکول میں زمینداروں تعلقداروں اور بھومی دھروں کے لڑکے بھی پڑھتے تھے اس لئے ان میں آپس میں اتفاق بے حد تھا۔ یہاں دو برس گذرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ایک امیر اور دوسرے غریب۔ بڑا طبقہ غریبوں کا ہے جن کا ان زمینداروں، تعلقداروں، صنعت کاروں، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور سرمایہ داروں کے ذریعہ استحصال کیا جاتا ہے۔ اس استحصال کے لئے بہت سے بہانے تلاش کر لئے گئے ہیں۔ جس میں مذہب کا نام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں، میں نے کچھ مضامین ہندی میں لکھے تھے جو ایک مقامی اخبار 'ماتر بھومی' میں شائع ہوئے تھے۔

میں یہاں سے ہائی اسکول پاس نہیں کر سکا تھا۔ ۶۱ء میں میرے دادا کا انتقال ہو گیا اور ہم سب لوگ اس کے بعد پٹنہ چلے آئے۔ یہاں سے میری زندگی کے ایک نئے باب کی شروعات ہوتی ہے۔

یہاں آکر میرا داخلہ بہت ہی تگ و دو کے بعد مسلم اسکول میں ہوا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس سے قبل میں نے اسکول میں اردو بالکل پڑھی ہی نہیں تھی اور اس اسکول میں تمام مضامین اردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے۔ نئی جگہ تھی نیا ماحول تھا جہاں کی ہر چیز میرے لئے نئی تھی۔ میں اسکول کے کسی لڑکے سے واقف نہیں تھا۔ بے حد اجنبی پن کا احساس ہوتا تھا۔ اسکول میں میرے مضامین بھی ایسے تھے جن سے میری کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میری دلچسپی ادب میں تھی اور مجھے علم کیمیا، علم نباتات و حیوانات اور علم طبیعات کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ میٹرک تو میں نے کسی نہ کسی طور پر پاس کر لیا۔ کالج میں بھی آئی۔ ایس۔ سی میں داخلہ مل گیا لیکن سائنس سے میری طبیعت بالکل اچاٹ ہو گئی تھی اس لئے ان میں میرا دل نہ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لگتا تھا۔ امتحانات کے زمانے میں بھی میں ادب کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس لئے فیل ہو گیا۔ پھر دوسرے سال قسمت آزمائی کی بات سوچی گئی۔ میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور میری طبیعت ان مضامین کی جانب راغب نہیں ہوتی تھی۔ پھر پٹنہ کے بہت بڑے عظیم الشان اسپتال میں، میں نے ڈاکٹروں کا جو قصائی پن دیکھا اس کی وجہ سے مجھے اس پیشے سے نفرت سی ہو گئی۔ ان تمام ڈاکٹروں میں مرحوم ڈاکٹر نذر امام شائد واحد ایسے ڈاکٹر تھے جنہیں دیکھ کر ان سے مل کر ان سے باتیں کر کے احساس ہوا کہ ڈاکٹر انسان بھی ہوتا ہے۔ پھر ویسا ڈاکٹر جو انسان بھی ہو میری نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔

بہر حال اس زمانے میں میرے ذہن میں عجیب کشاکش تھی میں ادیب بننا چاہتا تھا اور میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ شائد انہیں احساس تھا کہ ادیب زندگی میں بھوکوں مرتا ہے۔ مگر بہر حال جیت میری ہی ہوئی اور میں سائنس چھوڑ کر ادبیات کی جانب آ گیا۔ ڈاکٹر کہیں پیچھے چھوٹ گیا اور میں اس سے بہت آگے نکل گیا۔

میں نے اسکول و کالج کی تعلیم کے دوران کئی افسانے لکھے جو موقر رسائل میں شائع ہوئے اور انہیں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ میرا پہلا ہی افسانہ کراچی کے ماہنامہ 'نقش' میں ڈائجسٹ ہوا تھا یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں میرے افسانے 'صبح نو'، 'شاعر' 'ماہنو' بعد میں پھر تمام ہی اہم رسائل میں شائع ہوئے۔ پاکستان کے بھی موقر پرچوں میں میرے افسانے شائع ہوتے رہے۔ جن میں 'اوراق' کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا نے میری بہت ہمت افزائی کی۔

میں نے ۱۹۶۷ء میں رسالہ 'زیور' جاری کیا جو ۱۹۷۵ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا یہ دراصل میری صحافت کی ٹریننگ کا سینٹر تھا۔ کیونکہ میں نے صحافت کسی سے سیکھی نہیں بس خود ہی اس راستے پر چل پڑا اور اپنی منزلوں کا تعین بھی خود سے کیا۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اردو رسالہ نکالنا سفید ہاتھی پالنے سے کم نہیں۔ اس پر بھی اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی رسالہ خرید کر پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ اسے کسرِ شان سمجھتا ہے۔ سب لوگ یہی چاہتے ہیں کہ انہیں رسالے کی اعزازی کاپی ملے۔ 'زیور' مقبول تو بہت ہوا لیکن مستقل نقصان میں چلتا رہا۔ میری صحافتی زندگی میں ہر قدم پر جس نے میری مدد کی وہ شخصیت مسز عزیزہ امام کی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ پارلیامنٹ کی معزز رکن ہیں۔

دورانِ تعلیم میں نے صحافت کو محض تفریحاً اختیار کیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ میرا کوئی شغل نہیں کوئی دلچسپی نہیں اس سے میرے شوق کی بھی تکمیل ہو جاتی تھی۔ مگر میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ روگ میں نے زندگی بھر کے لئے پال لیا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد میرا ارادہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے کا تھا لیکن بی۔ اے آنرز کرنے کے بعد جب میں نے ایم۔ اے کی تکمیل شروع کی تو مجھے یونیورسٹی کے شعبوں کی گندگی اور غلاظت کا عرفان ہوا۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ علم کی روشنی پھیلانے والے اتنے تاریک الذہن ہیں اور ایک جمہوری ملک میں اپنے اپنے شعبوں میں انھوں نے آمرانہ نظام قائم کر رکھا ہے کہ ان کا ہر حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہاں اس قدر گندگی، غلاظت، سڑاند اور عفونت تھی کہ دم گھٹتا تھا۔ گھن آتی تھی۔ ان قصائیوں نے اپنی انا کی تسکین کے لئے جانے کتنے بہترین اذہان کو اس قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ مجھ سے یہ سب ظلم برداشت نہیں ہو سکا اور میں چیخ پڑا۔ میں ایسا بدبخت انسان تھا کہ جو اپنے ہی اساتذہ کے سامنے شمشیر برہنہ لے کر کھڑا ہو گیا کیونکہ میں یہ مظالم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر میں خاموش رہوں گا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ پھر مجھے ارسطو کا یہ قول یاد آیا کہ مجھے اپنے استاد کا ادب ملحوظ ہے لیکن اس کی وجہ سے میں حق بات کہنے میں تامل نہیں کروں گا۔ میں عجیب دھرم سنکٹ میں تھا۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر مجھے قرآن کا قول یاد آیا "کہ تم سچ کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ" اور پھر وہ حدیث کہ ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ میں نے ان سے رہنمائی حاصل کی۔

میں نے جب اپنے اخبار کا افتتاحی شمارہ شائع کیا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ قسم کھائی کہ میں سچ بولوں گا سچ لکھوں گا خواہ اس کے لئے مجھے کیسی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اور ہر سال اس کی تجدید کرتا ہوں۔ میری صحافت کی راہ بے حد پر خار ہے لیکن کیا کروں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ "عظیم آباد اکسپریس" میری زندگی میں آندھی اور طوفان بن کر آئے گا۔ اس نے میری زندگی کو عجیب طوفان سے دوچار کر دیا۔ ایک طرف سچ بولنے کی قسم دوسری طرف حالات کی موجوں کے تھپیڑے۔ خدا کا کرم کچھ ایسا ہوا کہ مجھے ہر محاذ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرا اتنا چھوٹا سا اخبار بھی اتنی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی صدائے احتجاج پر اتنی توجہ بھی دی جا سکتی ہے۔ میں نے صحافت کو تجارت سمجھ کر نہیں بلکہ عبادت و ریاضت سمجھ کر اختیار کیا تاکہ ظلم، بربریت، استحصال، جور و استبداد کے خلاف کمزور سی ہی سہی آواز ضرور اٹھائی جائے۔ یہ بات کہنے میں بہت آسان ہے لیکن اس پر عمل بے حد دشوار ہے۔ کیونکہ سچ بولنا بے حد مشکل کام ہے۔ کوئی بھی سچ بولنے سے خوش نہیں ہوتا۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اور اپنے منھ کو کوئی کڑوا کرنا نہیں چاہتا۔ آج صحافت

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

صنعت اور تجارت بن گئی ہے لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں ایسے میں کوئی سوچے کہ وہ صحافت کو عبادت دریاضت سمجھ کر اختیار کرے گا تو اسے لوگ پاگل اور جنونی نہیں تو کیا سمجھیں گے۔ مجھ سے بار بار میرے خیر خواہوں نے کہا کہ یہ راستہ خطرناک ہے اسے ترک کر دو اگر اخبار نکالنا ہے اور پیسے کمانے ہیں تو قصیدہ خوانی کے لئے نکالو۔ لیکن میرے دل میں تو کچھ اور ہی ہے۔ میں اخبار کے دفتر کو بنئے کی دوکان نہیں سمجھتا کہ وقت کے لحاظ سے اپنے کو بدلتے رہو۔ میرا ایک نظریہ ہے جس پر میں سختی سے کاربند ہوں۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

مگر پھر بھی میں سوچتا تھا کہ میرے اسلاف تلوار کے دھنی رہے ہیں۔ انھوں نے رن کے میدانوں میں تلوار کے جوہر دکھائے، جانے کتنی جنگیں لڑیں۔ تو کیا میں اپنے قلم سے تلوار کا کام لے سکوں گا۔ کیا میرے اندر اتنی ہمت و جرأت ہے کہ دادِ شجاعت دے سکوں۔ اخبار نکالنے سے قبل میں عجیب و غریب کیفیت سے گذرا۔ ایک طرف ظلم کے مارے بے بس، بے زبان لوگ تھے جن کی حالت پر میں کڑھتا تھا اور دوسری طرف میرا کیریر تھا۔ مگر میرے خاندان کا عجیب و غریب عالم رہا ہے۔ کسی نے کبھی کیریر کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ سب سے بڑی چیز خود داری ہے جس کے لئے میرے دادا مرحوم نے سرکاری نوکری کو لات مار دی تھی۔ وہ اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ان سے انگریز انسپکٹر آف اسکولس سے اختلافات ہو گئے۔ کیونکہ ان کے خیالات انقلابی تھے جس سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ ان کی کچھ نظمیں بھی اسے ناگوار گزری تھیں اس لئے انھوں نے بلا تامل استعفیٰ دے دیا اور پوری زندگی طبابت کرتے رہے کبھی ملازمت کی خواہش نہیں کی۔ میرے والد صاحب (حکیم مشتاق احمد خان غبار بھٹی) کو بھی نوکری راس نہیں آئی حالانکہ اسی کی وجہ سے وہ دہلی، کانپور اور بالکل

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہی اجنبی جگہ پٹنہ آئے لیکن چند ہی برسوں کی ملازمت کے بعد اس پر ٹھوکر مار دی اور پھر کبھی کسی نوکری کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نظر نہیں ڈالی۔ یوں میرے خاندان کے افراد کو نوکری کبھی راس نہیں آئی اس لئے میں نے بھی یہی سنّت تازہ کی۔ مجھے تو نوکری کرنے سے قبل ہی اس سے نفرت ہو گئی اور میں نے کبھی ملازمت کی خواہش نہیں کی نہ اس کے لئے درخواست دی ——

بس اب تو قلم کاغذ اور الفاظ سے رشتہ قائم کر لیا ہے یہ رشتہ جنم جنم کا ہے اس لئے اس کے ٹوٹنے کا کوئی سوال نہیں۔ باقی سارے رشتے ناپائیدار ہیں صرف یہی ایک رشتہ پائیدار ہے۔

اب تیغ و تیر کا تو زمانہ نہیں شمشیر و سنان کا بھی دور نہیں۔ اب تو مجھے قلم سے ہی ان سب اسلحوں کا کام لینا ہے کیونکہ اس دور میں الفاظ میں بہت بڑی طاقت ہے۔ لیکن الفاظ کا استعمال شمشیر زنی سے زیادہ مشکل ہے۔ الفاظ کی طرح کمان سے نکلا ہوا تیر بھی واپس نہیں آتا۔ تیر کا نشانہ خطا کر سکتا ہے لیکن الفاظ کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ تیر سے ایک وقت میں ایک ہی گھائل ہوتا ہے لیکن ایک ہی لفظ بیک وقت کتنوں کو گھائل کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لئے یہ زمانہ تیر و تفنگ کا نہیں الفاظ و معانی کا ہے۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

میں نے اپنا کیریر اسی آگ میں جھونک دیا۔ پہلی منزل ہی پر ڈاکٹر کسی شعلے کی نذر ہو گیا، لکچرر کہیں پیچھے رہ گیا اور میں آگے نکل گیا بے منزل، بے نشان۔

جب سے جانا کہ اب کوئی منزل نہیں
منزلیں راہ میں آتی جاتی رہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں جب قلم لیکر اخبار کے لئے لکھنے بیٹھتا ہوں تو مجھے سچ بولنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر واقعہ اور بھی ہے۔

۱۹۷۴ء میں، میں لکھنؤ ایک صحافتی ورک شاپ میں گیا تھا۔ دو ہفتوں کا پروگرام تھا۔ یہ ورک شاپ مرکزی حکومت کے تحت چلنے والے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن نے کروایا تھا۔ اس میں جہاں مختلف موضوعات پر سمینار و لکچر ہوتے وہیں کچھ گھومنے پھرنے کا پروگرام تھا۔ ایک روز ہم سب لوگ دیوی شریف بھی گئے۔ یہ بارہ بنکی ضلع میں بہت ہی مشہور درگاہ ہے جہاں حضرت حاجی وارث علی شاہؒ کا مزار ہے۔ میرے لئے دیوی جانے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا بلکہ اس سے قبل بھی میں متعدد بار وہاں جا چکا تھا ہر سال سردیوں کے زمانے میں وہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور پوری دنیا سے لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ حضرت وارث علی شاہ کے معتقدین پوری دنیا میں موجود ہیں۔ مجھے بچپن سے ہی ان سے بڑی عقیدت رہی ہے۔ میں پہلی بار بہت ہی کم عمری میں وہاں گیا تھا شائد پانچ چھ سال عمر رہی ہوگی۔ لیکن میلے کے علاوہ کبھی وہاں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دیوی بہت ہی چھوٹا سا قصبہ ہے اس کی اہمیت صرف اس مزار کی وجہ سے ہے۔ میرے نانا مرحوم بھی وارث علی شاہ کا ذکر کرتے رہتے تھے انھوں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کیونکہ وہ ہمارے گاؤں میں بھی آتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کبھی بھی جوتا یا چپل نہیں پہنتے تھے لیکن ان کے پیروں میں نہ دھول ٹکتی تھی اور نہ کوئی اور چیز ان کے تلوے صاف شفاف اور روشن رہتے تھے۔

ہم لوگ دیوی پہونچے تو وہ دن جمعہ کا تھا۔ سوچا گیا کہ پہلے نماز پڑھ لی جائے۔ تو پھر زیارت کی جائے۔ ہمارے قافلے میں کچھ غیر مسلم حضرات بھی تھے جو سکریٹری کے کمرے میں سستانے چلے گئے۔ ہم لوگ پاس ہی کی چھوٹی سی پرانی اور تاریخی مسجد میں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نماز پڑھنے کے لئے گئے۔ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی "قلم ہاتھ میں لیا ہے تو سچ بولنا۔ ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا غیب سے تمہاری مدد ہوگی" میں نے مڑ کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ لیکن یہ جملے میرے کانوں میں مسلسل گونجتے رہے۔ "سچ بولنا۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا۔ غیب سے مدد ہوگی"

ہم لوگ نماز کے بعد درگاہ کی زیارت کے لئے گئے۔ جو خاص طور پر ہمارے لئے ہی کھول گئی تھی۔ ہمیں زعفرانی رومال بھی بطور تحفہ دیئے گئے اور خرمے بھی۔ لیکن ساری زیارت کے دوران میں جیسے بالکل مبہوت سا رہا مجھے سرگوشیوں کا احساس ہوتا اور کسی کی قدموں کی آہٹ کا۔ شام کو لکھنؤ واپس پہونچے تو میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ بلکہ اس روز شام کو ہونے والے ثقافتی پروگرام میں بھی نہیں گیا۔ اپنے کمرے میں آکر سو رہا۔ مجھے تیز بخار تھا۔ رات بھر میں عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا کہ میں ایک گھنے جنگل سے گذر رہا ہوں خونخوار درندے آکر بار بار مجھ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور بار بار کوئی درمیان میں آکر ان کے وار ناکام بنا دیتا ہے۔ ان کے خونی پنجے میرے جسم تک پہونچ ہی نہیں پاتے۔ صبح آنکھ کھلی تو میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ صرف تھکان تھی۔ میں نے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ آج تک نہیں کیا۔ اس لئے کہ شائد کوئی اس پر یقین ہی نہیں کرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں صرف اس طاقت کے سہارے ہی سچ بول رہا ہوں اور وہی غیبی طاقت میرے تمام بدخواہوں اور دشمنوں کے حملوں کو ناکام بنا دیتی ہے ورنہ میرے جیسے ناتواں کمزور بزدل اور گاؤں کے ڈرپوک لڑکے میں اتنی جرأت کہاں سے آجاتی جو طاقت کے نشے میں چور انسانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ میں خود کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا واقعی یہ اداریے میں نے لکھے ہیں؟

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

۱۹۷۴ء میں ایک تیز رفتار ٹیکسی سے میرا حادثہ ہوا۔ میں سڑک پار کر رہا تھا کہ اس نے مجھے ٹکر مار دی مگر مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ شائد یہ حادثہ بہت شدید ہوتا۔ لیکن مجھے معمولی چوٹیں آئیں۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔ بعد میں مجھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ لیکن کسی طاقت نے مجھے گھسیٹ کر بچا لیا۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

میں نہیں جانتا کہ یہ کون سی طاقت ہے جو ہر مشکل وقت میں میری مدد کرتی ہے۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اسی کی بدولت میں سچ بول رہا ہوں۔ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب زمانے میں صرف جھوٹ کا بول بالا ہو تو سچ بولنا بے حد مشکل کام ہے۔ سچ بولنے والوں کو ہمیشہ سزا ملی ہے۔

میں نے اب تک تین سو سے زائد اداریے لکھے ہیں۔ یہ تمام اداریے ظلم، سفاکی، بربریت، استحصال کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں ایک معمولی قلم کار اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ ان اداریوں کی تعریف میں میرے پاس ہزاروں کی تعداد میں خطوط آئے ہیں جن سے مجھے تقویت ملتی رہی ہے۔ تعریفی خطوط لکھنے والوں میں بین الاقوامی شہرت کے دانشور، ادیب، صحافی فن کار اور سیاست داں شامل ہیں۔ اس سے کم از کم میں نے یہ اندازہ ضرور کیا ہے کہ آج بھی سچ کی قدر ہوتی ہے۔ جہاں بہت سے لوگوں کو سچ شاق گزرتا ہے وہیں اس کے قدرداں بھی ہیں۔ بعض اشخاص کو یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنے اداریوں کے مجموعے کا نام 'مجھے بولنے دو' کیوں رکھا ہے کیونکہ اس نام میں وہ گھن گرج نہیں ہے جو میرے اداریوں میں موجود ہے جبکہ اس سے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ یقیناً میرے ادارے ایک بے بس انسان کی چیخ ہیں جو اپنے اندر چھٹپٹاہٹ محسوس کرتا ہے۔ جو تمام مظالم دیکھ کر کڑھتا ہے لیکن اس نظام کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تو اسے اس ماحول میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے کو بالکل بے بس پاتا ہے اور ایسے وقت میں خود بخود اس کے منھ سے بے اختیارانہ چیخ نکل جاتی ہے اور میرے ادارے بھی بے بسی کی چیخ ہیں۔

میں نے یہ ادارے محض لکھنے کے لئے نہیں لکھے ہیں بلکہ ایک مشن کے تحت لکھے ہیں۔ ان میں میرا خون جگر شامل ہے البتہ میں نے تحریر کی نوک پلک سنوارنے کی کوشش کبھی نہیں کی مجھے زبان دانی کا کوئی دعویٰ بھی نہیں ہے۔ میرا تعلق سماج کے جس طبقے اور جس معاشرے سے ہے ان میں باتیں الفاظ و معانی تحریر و تقریر میں کم اور خاموشی و بے زبانی کی زبان میں زیادہ کی جاتی ہیں۔ چونکہ 'عظیم آباد اکسپریس' ایک اخبار نہیں بلکہ ناانصافیوں کے خلاف ایک تحریک ہے اس لئے میں نے جو کچھ لکھا ہے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھا ہے بلکہ میں اسے کاغذ پر چھپنے والا اخبار مانتا ہی نہیں یہ تو خونِ جگر کی روشنائی سے دل کے اوراق پر چھپنے والا اخبار ہے۔ میری تحریروں میں زبان و بیان کی کمزوریاں جو کچھ بھی ہوں لیکن ان میں خلوص کی فراوانی ملے گی یہ خلوص ہی انہیں منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دل سے بے تابانہ نکلنے والی یہ آواز سیدھے دل ہی میں جا کر رکتی ہے۔

میں اشخاص و افراد کے خلاف لکھنے سے زیادہ ان مظالم کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں جو انسان انسان کے درمیان تفریق روا رکھتا ہے۔ جو آدمی کو حیوان بنا دیتا ہے۔ مگر شاید حیوان کی اصطلاح غلط ہے کیونکہ حیوان ہم جنس پر کبھی ظلم روا نہیں رکھتا۔ انسان ان حدوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ یہ ہمارے دور کا عجیب المیہ ہے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

میں برسہا برس سے سنیاس لیکر نگری نگری، قریہ قریہ، صحرا صحرا گھوم رہا ہوں۔ کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے اور کتنی جگہ منہ کے بل گر پڑا ہوں۔ پھر اٹھا ہوں اور اٹھ کر نئے جوش و ولولے کے ساتھ چلا ہوں۔ کسی فرعونِ وقت کی طاقت نے کبھی میرے دل میں خوف و ہراس پیدا نہیں کیا کیونکہ میرے دل میں پہلے سے خدا کا خوف موجود ہے۔ اس عرصے میں، میں نے کتنے سیاہ دن اور کتنی اجلی راتیں دیکھی ہیں۔ کتنوں نے اپنے بے پناہ طاقت کے زعم میں میرے قلم کو توڑنے اور مروڑنے کی کوشش کی ہے۔ میرے ناتواں ہاتھوں سے قلم چھیننے کی کوشش کی ہے لیکن انہیں ہر بار ناکامی ہوئی ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں سچ کا ایک لفظ پوری کائنات پر بھاری ہوتا ہے شر وقتی طور پر کتنا ہی حاوی کیوں نہ ہو جائے لیکن فتح بالآخر خیر کی ہوتی ہے۔ سانچ کو کبھی آنچ نہیں آسکتی۔ جب کوئی چنگیز و ہلاکو میرے مقابل ہوتا ہے تو خدا جانے میرے ناتواں بازوؤں میں کہاں سے طاقت آجاتی ہے اور میں اس سے نبرد آزما ہو جاتا ہوں۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ پوری کائنات پر شر کی قوتیں حاوی ہوتی جا رہی ہیں اور یہ دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا دیں گی لیکن ایسا شائد اس وقت تک ممکن نہ ہو سکے گا جب تک اس دنیا میں ایک بھی شخص سچ بولنے کی جرأت کرے گا۔

میرے شب و روز جن آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں رہتے ہیں مجھے ان سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہے کیونکہ انہیں طوفانوں نے تو مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ انہیں آندھیوں نے تو مجھے طاقت پرواز دی ہے۔ میں تو ان کا احسان مند ہوں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آندھیوں سے میں نے پائی قوت پروازِ شوق
لائے ہیں اڑ کر بگولے بال و پر میرے لئے

میں نے اپنی کھلی آنکھوں سے بہت ظلم دیکھا ہے اور اپنے اوپر جبر کیا ہے لیکن جب سے قلم ہاتھوں میں آیا ہے قوت برداشت کھو چکا ہوں جس کی سزا مجھے وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہے۔ کبھی دھمکیاں ملتی ہیں۔ کبھی سخت سست باتیں سننی پڑتی ہیں۔ کبھی عدالتوں اور پریس کونسل میں گھسیٹا جاتا ہوں۔ گویا زندگی ایک طوفان بن چکی ہے کہ ہر موج کے تھپیڑے کھانا مقدر ہے۔ شائد میں اسی طوفان میں ادنیٰ تنکے کی طرح تھپیڑے کھاتا رہوں گا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

میں نے اپنی افتادِ طبع اور باغیانہ ذہنیت کی وجہ سے اپنا پورا مستقبل آگ کے لہلہاتے شعلوں کے حوالے کر دیا ہے، اور سود و زیاں کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ میں اپنی بوریہ نشینی میں خوش ہوں۔ میں زخموں کو یہ کھیتی دیکھ کر بھی خوش ہوں۔ شائد اسی کا نام زندگی ہے۔

مجھے اپنی تحریروں کے بارے میں زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کیونکہ اس سے مجھے اکتاہٹ ہوتی ہے کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ بھی نہیں جس کا حوالہ دوں۔ لوگ پسند کرتے اور تعریف کر دیتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جہاں تک صحافت کا سوال ہے میرا ایک واضح رویہ ہے اور میں منافقت و مصلحت کوشی سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ دوہری پالیسی میں نے کبھی اختیار نہیں کی۔ ایک بار محسنہ آپا (مسز محسنہ قدوائی) نے شریمتی اندرا گاندھی کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ "آپ ان کے اداریے پڑھ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سکتیں تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ ایسے جرأت مند صحافی بھی ہمارے ملک میں ہیں ۔

جب ۷۵ء میں ایمرجنسی کا نفاذ ہوا تو میں دو تین دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلا ۔ میرا خیال تھا کہ اب اپنے احساسات کی ترسیل نہ کر سکوں گا ۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے گلے میں کوئی پھندا سا پڑ گیا ہے جو حلق کو کستا جا رہا ہے اور گھٹن بڑھتی جا رہی ہے ۔ ہمارے سماج میں یہ ایک نئی تبدیلی تھی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ صالح تنقید کی گنجائش اب بھی ہے ۔ اور اس وقت بھی میں نے کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا ۔ ویسے میں آزادیٔ صحافت کا حامی ہوں اور آزادیٔ اظہار پر کسی قسم کی پابندی کا شدید مخالف لیکن میں اس بات میں بھی اعتماد کرتا ہوں کہ آزادی کے معنی بے لگام ہونا نہیں ہیں اور نہ ہی شخصی مفاد کے لئے قومی مفادات کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے ۔

میں کئی صحافتی تنظیموں کا ممبر اور عہدہ دار بھی رہا ہوں اور ان پلیٹ فارموں پر بھی اپنے خیالات و احساسات کا اظہار بے جھجک کرتا رہا ہوں میں نے اس بات کی پرواہ کبھی نہیں کی میری باتوں کو کون ناپسند کرتا ہے اور کون پسند کرتا ہے ۔ ایک ایماندار صحافی کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ وقت کی پیشانی کے تیور دیکھ کر باتیں کرے ۔

مجھ سے اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ میرا من پسند موضوع ہندوستانی مسلمان ہی کیوں ہیں جن پر زیادہ تر قلم اٹھاتا ہوں ۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اسی سماج کا ایک فرد ہوں ۔ پھر ہندوستانی مسلمان آزادی کے بعد سے جس المیہ کا شکار ہیں وہ لاثانی ہے ۔ ان کی ناکامیوں اور محرومیوں کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے ۔ جس کے دل میں درد ہوتا ہے وہی اسے محسوس بھی کرتا ہے ۔ یہ ہمارا کرب ہے جس سے ہمیں ایک لمحہ نجات نہیں ۔ ایک واقعہ پر سینہ کوبی ختم نہیں ہوتی کہ دوسرے کئی حادثات

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

گزر جاتے ہیں اب تو یہ زندگی ہی سانحہ محسوس ہونے لگی ہے۔

قلم سے میرا رشتہ افسانہ نگاری کی وجہ سے پیدا ہوا لیکن وقت نے اسے صحافت کی جانب موڑ دیا مگر میں اب بھی افسانے لکھتا ہوں اور مجھے بحیثیت افسانہ نگار جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے میں غیر مطمئن نہیں ہوں بلکہ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اردو افسانے کے تئیں جو میری حقیر خدمات ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کو اہمیت دی گئی ہے۔ میرا افسانوی مجموعہ 'مسدود راہوں کے مسافر' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس پر ہندو پاک کے موقر رسائل میں سربرآوردہ شخصیتوں کے پچاس سے زائد تبصرے و مضامین شائع ہوئے اور شاید کسی افسانوی مجموعہ پر گزشتہ پوری دہائی میں اتنے تبصرے نہیں آئے۔ ایک ٹی۔ وی انٹرویو میں مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ میں افسانہ نگار ہوں اور صحافی بھی تو میں ان دونوں میں کس طرح توازن برقرار رکھتا ہوں۔ میں نے یہی جواب دیا تھا کہ میری صحافت میری افسانہ نگاری سے الگ نہیں کیونکہ میں دونوں کے لئے اپنے معاشرے، اپنے سماج اور گرد و پیش سے ہی مواد حاصل کرتا ہوں۔ اسالیب ضرور مختلف ہیں لیکن میں اپنی اداریہ نگاری کو اپنی افسانہ نگاری سے الگ نہیں سمجھتا اس لئے مجھے اپنے افسانوں کو اداریہ اور اداریوں کو افسانہ کہنے پر اصرار ہے۔ بلکہ میرے اداریے تو درد و کرب، رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ایسی کربناک کہانی ہیں جس کا کوئی انت نہیں ہے۔

گزشتہ سال 'فن و شخصیت' کے مدیر صابر دت نے کافی اصرار کر کے آپ بیتی نمبر کے لئے مجھ جیسے حقیر فقیر کی بھی آپ بیتی لکھوائی اور اسے شائع کر دیا۔ ان کے اصرار پر وہ تحریر میں نے بہت جلد بازی میں لکھی تھی۔ جو باتیں یاد آئیں لکھ دیں۔ تلخ، کڑوی، کسیلی اور بدمزہ مگر میں کیا کروں اس کے علاوہ تو میری زندگی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں اور کچھ ہے بھی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کو خود دریا ہی کیا ہے۔

غیروں کا دکھ درد اپنا کرنے نکلے کھلو کر کھلے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اس سے بھی دیوانے ہم

درحقیقت یہ قلم میرا سب سے بڑا دشمن ہے جب تک یہ میری انگلیوں میں دبا رہے گا مجھے سچ بولنے پر مجبور کرتا رہے گا اور میرے وجود کو لہولہان کرواتا رہے گا۔ سچ تو کسی کو سکون سے جینے نہیں دیتا وہ بھی ایسے زمانے میں جب انسان بے چہرگی کا شکار ہو اور اس نے ایک چہرے پر متعدد چہرے لگا رکھے ہوں جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہوں۔ ان بلاخیز طوفانوں کی زد میں ہونے کی وجہ سے اپنی بیتا بھی یاد نہیں رہتی جسے میں سنانا چاہتا ہوں۔

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں ؛ لیکن اب تمہید ذکر دردِ ماتم ہو گئیں

میرا جرم صرف یہی ہے کہ میں نے غریبوں، مفلسوں، مظلوموں، دبے کچلے اور ستائے ہوئے لوگوں کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ ان کی بے زبانی کو زبان دینے کی سعی کی ہے۔ میں نے ان بے مایہ انسانوں کو وقت کے فرعونوں، ہامانوں اور شدادوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو میں ضرور مجرم ہوں۔ اگر اس جرم پر لوگ مجھ سے خفا ہیں تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔

طبل و علم نہ پاس ہمارے نہ ملک و جاہ
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

میرا جرم یہ بھی ہے کہ میں نے کبھی وقت کی مصلحتیں دیکھ کر بات نہیں کی۔ حکمرانِ وقت کی پیشانیوں کی تیوریاں دیکھ کر اپنی بات میں کوئی ترمیم نہیں کی اور

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ان کی تیوریوں کے بل دیکھ کر اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مجھے ان کے تیور خوفزدہ نہیں کر سکے بلکہ میرے حوصلے اور بڑھ گئے۔ ان کی لہجے کی گرج میرے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکی کیونکہ میرے عزائم بھی چٹان تھے۔ سخت مضبوط اور بلند۔

میں جو جنگ لڑ رہا ہوں یہ ایک مہابھارت ہے۔ جب کمان اٹھاتا ہوں تو سب اپنے ہی نظر آتے ہیں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ یہ جنگ ایسی ہے جس میں اپنوں سے بھی لڑنا پڑے گا بلکہ اپنے آپ سے بھی لڑنا پڑے گا۔ یہ جنگ جسم کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ یہ طویل سرد جنگ میں نے برسہا برس لڑی ہے۔ اپنے آپ سے لڑی ہے۔ ایسے اوقات میں، میں ارسطو کا یہ قول دہراتا رہا ہوں۔

"مجھے اپنے استاد کا ادب ملحوظ ہے لیکن اس سے زیادہ میں صداقت کا پاس و لحاظ کرتا ہوں"

جب میرے احباب، میرے دوست، میرے کرم فرما چند قدم بھی میرے ساتھ نہیں چل پاتے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بہت اکیلا ہوں اور یہ جنگ مجھے تنہا ہی لڑنی پڑے گی۔ یہ مہابھارت کون جیتے گا کون ہارے گا اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ کیونکہ خیر و شر کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ فی الحال تو میں اتنا جانتا ہوں کہ میں تیروں کی باڑھ پر ہوں۔ میری جانب بہت سی کمانیں تنی ہوئی ہیں۔ کون جانے یہ زہریلے تیر کب فضا میں پرواز کرنے لگیں۔ مگر میں نے ان کی پرواہ کب کی ہے۔ آخر تو مجھے سچ بولنے کا مزا چکھنا ہے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے نہ اپنوں سے شکایت ہے اور نہ غیروں سے۔

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون ؟

روزنامہ عظیم آباد اکسپریس پٹنہ ۱۹

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مکمل انقلاب کی تیسری سالگرہ!

لوک نائک سے شری جے پرکاش نرائن نے کہا ہے کہ عوام ۵ جون کو "مکمل انقلاب" کی تیسری سالگرہ منائیں۔ اسی تاریخ سے کانگریس حکومت کے خلاف لوک نائک نے تحریک کا آغاز کیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا انقلاب؟ کیا واقعی کوئی انقلاب رونما ہوا ہے؟ ہوا ہے تو روز و شب ویسے ہی کیوں ہیں جیسے کہ تین ماہ قبل تھے۔ بلکہ اگر کوئی نمایاں فرق ہوا ہے تو یہ کہ چوری، ڈکیتی، غنڈہ گردی، رہزنی اور چھینا جھپٹی کے واقعات میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ "مکمل انقلاب" کا مقصد قطعی یہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا اس لئے جشن کس چیز کا منایا جائے؟ خوشی کس کی منائی جائے مرکز میں نئی حکومت کے قیام کو (بنے ہوئے) ۷۵ دن ہو گئے۔ اسطرح جنتا پارٹی کی حکومت نے اگر کوئی کارِ نمایاں انجام دیا ہے تو وہ ہے نو ریاستی اسمبلیوں کا توڑا جانا۔ اس کا بھی "مکمل انقلاب" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ تین سال قبل شری جے پرکاش نرائن نے "مکمل انقلاب" کا نعرہ کیوں دیا تھا؟ تحریک چلائی تھی تو کس کے خلاف؟ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

تین سال قبل کے شری جے پرکاش نرائن کے بیانات اٹھا کر دیکھئے تو اندازہ ہو

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جائے گا کہ انھوں نے جو تحریک چلائی تھی وہ کسی فرد واحد یا کسی پارٹی کے خلاف نہیں تھی وہ تحریک تھی کرپشن، بے ایمانی، بدعنوانی، بھرشٹاچار، رشوت ستانی اور مہنگائی کیخلاف جنتا پارٹی بار بار یہ کہتی ہے کہ اس نے تحریر و تقریر کی آزادی بحال کر دی ہے۔ فرد کی آزادی بحال کر دی ہے۔ زبانوں اور قلموں پر لگے ہوئے تالے کھول دیئے ہیں۔ اخبارات کو انکی آزادی لوٹا دی ہے عدلیہ کی آزادی بحال کر دی ہے۔ لیکن یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ تین سال قبل تو یہ ساری آزادیاں تھیں ہی۔ ان کی بحالی کیلئے تو تحریک چلائی نہیں گئی تھی بلکہ اس تحریک کے نتیجے میں ان آزادیوں پر ضرب پڑی تھی۔

جب تحریک مہنگائی، کرپشن، بدعنوانی، بھرشٹاچار کے خلاف تھی تو سب سے پہلے ان کا سدباب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن کیا ان کے برعکس نہیں ہوا ہے؟ کیا جنتا پارٹی کی حکومت بننے کے بعد سے ہر چیز کی قیمتیں آسمان کی جانب نہیں پرواز کر رہی ہیں؟ کیا یہ قیمتیں ان قیمتوں سے زیادہ نہیں ہیں جو اب سے تین سال قبل تھیں۔ اور جن کو بہانہ بنا کر تحریک چلائی گئی تھی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سالگرہ کس چیز کی منائی جائے؟

میں اگر یہ کہوں کہ ہندوستان کے عوام جتنے اداس اور دکھی اس وقت ہیں اس سے قبل کبھی نہیں تھے۔ انسان کی بنیادی ضرورت روٹی ہے، اس کے بعد ہے آزادی، نہ صرف انسان روٹی سے زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی صرف آزادی سے۔ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ آزادی اظہار کے بغیر تو انسان کچھ دیر زندہ بھی رہ لے گا۔ لیکن بغیر روٹی کے ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو بنیادی اور اولین ضرورت روٹی ہی ہے۔ اور یہ روٹی روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ غریب عوام کی قوت خرید سے باہر ہوتی جا رہی ہے ——— پھر یہ کیسا "مکمل انقلاب" ہے؟

کیا ہندوستان کیلئے آپ ایسا ہی "مکمل انقلاب" چاہتے تھے؟ کیا یہ وہی سحر ہے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جس کے لئے آپ اتنی راتوں سے جدوجہد کر رہے تھے۔ کیا یہی گاندھیائی راستہ ہے؟ کیا یہی رام راجیہ ہے ——— ؟ اور اب تو آر ایس ایس کے بالا صاحب دیورس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جے پرکاش نرائن کا مکمل انقلاب محض ڈھونگ ہے، یہ مذاق ہے، یہ ناقابل عمل ہے۔

اور میں بھی کہنے کی جرأت کرنا چاہوں گا کہ بار بار مہاتما گاندھی کا نام لے کر اور ان کی تقلید کرنے کی باتیں کہہ کر، ان کی آتما کو دکھ دیا جاتا ہے۔ کون گاندھیائی راستہ پر چلنا چاہتا ہے؟ کون صدق دلی سے ان کی تقلید کرنا چاہتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا ——— کیا جنتا پارٹی کے وزراء اور ممبران مجلس قانون ساز اس ضابطے پر عمل کر رہے ہیں، جو ان کیلئے مہاتما گاندھی نے وضع کیا تھا؟ مہاتما گاندھی تو پورا لباس تک نہیں پہنتے تھے۔ وہ تو بس اتنے ہی لباس پر اکتفا کرتے تھے جتنا کہ جسم ڈھکنے کے لئے ضروری تھا۔ کیا جنتا پارٹی کا کوئی فرد ایسا کر رہا ہے؟ ان کے پاس رہنے کیلئے کوئی شاندار کوٹھی نہیں تھی؛ ان کے پاس کوئی بینک بیلنس بھی نہیں تھا! انھوں نے تو اپنے لئے کبھی کوئی رقم پس انداز نہیں کی یہ منصب تو بہت مشکل سے کسی کو ملتا ہے۔ اس لئے گاندھی سمادھی پر جاکر ان کے راستے پر چلنے کا عہد کرنا اور قسم کھانا ——— پھر اگر اس کی خلاف ورزی کرنا، ان کی آتما کو دکھ پہونچانا نہیں تو اور کیا ہے؟!

عوام کو یہ کہہ کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ روز بروز جو مہنگائی بڑھ رہی ہے اس کی ذمہ دار کانگریس ہے۔ عوام نے عنان حکومت تو اسی لئے جنتا پارٹی کے ہاتھوں میں سونپی ہے کہ وہ اس کا سدباب کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو اسے محض کسی دوسرے پر الزام رکھ دینے سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ ذمہ داری سے بھاگا نہیں جا سکتا۔ فرض سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مہنگائی دو ماہ میں کم ہو گی۔ کبھی تین ماہ میں اور کبھی ایک سال کی بات کہی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو شاید یہ پتہ نہیں ہے کہ عوام ان کے اقدام کا کتنی بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ زیادہ صبر کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے۔ قیمتیں کم نہیں ہو رہی ہیں تو اس کا علاج حکومت کے پاس ہے۔ آخر عوام نے حکومت کی باگ ڈور جنتا پارٹی کے ہاتھوں میں کیوں دی ہے؟

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر ! کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

پھر سمپورن کرانتی دوس منانے سے کیا فائدہ، ایسا کر کے تو لوگ اپنے ہی زخموں کی کھرنڈ چھڑائیں گے۔ اور یہ ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ کوئی اس سے گزرنا نہیں چاہتا۔

جے پرکاش جی اگر واقعی مکمل انقلاب چاہتے ہیں تو انہیں ایک اور تحریک کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ محض حکومتوں کے بدل جانے سے انقلابات نہیں آیا کرتے! ـــــ لیکن حکومت اسی ڈگر پر ہی چلتی رہی تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ عوام خود ایک تحریک کے دروازے پر دستک دیدیں گے۔ اس لئے کہ تحریکیں ہمیشہ حالات کے پیٹ سے جنم لیتی ہیں۔

جنتا پارٹی کی کارکردگی نے جس طرح عوام کو مایوس کر دیا ہے اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ان کی یہ بدظنی انہیں کس طرف لے جائے گی۔ کوئی بھی حکمراں عوام کو زیادہ دنوں تک دھوکا نہیں دے سکتا۔ زیادہ دنوں تک اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔ خود لوک نائک نے کہا تھا کہ ہندوستان میں عوام کا کام محض پانچ سال کے بعد ووٹ دینا رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ جمہوری حکومت میں ان کا کسی طرح کا تعاون شامل نہیں ہے۔ بالکل وہی کیفیت اب تک ہے۔ جنتا پارٹی بھی ووٹ لینے کے بعد عوام کو بھول گئی ہے۔ اب اسمبلی کے الیکشن آ گئے ہیں تو عوام کا خیال پیدا ہوا ہے۔ لیکن جنتا پارٹی کے لیڈران یہ جانتے ہیں کہ عوام کو وہ اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں کر سکتے اسی لئے عوام کو دھوکا دینے کی غرض سے بجٹ پیش

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نہیں کیا گیا تاکہ انتخابات متاثر نہ ہوں۔ اس لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ آنے والا بجٹ ٹیکس اور مہنگائی بڑھا کر عوام کی کمر توڑ دے گا۔

جب عوام مقصد کے قریب نہیں پہنچ سکے، جب منزل نہیں ملی، جب انقلاب نہیں آیا تو "سمپورن کرانتی دِوس" منانے سے حاصل کیا ہے؟

۵ جون ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

میں سمجھ نہیں پاتا کہ جنتا حکومت نے جو فراریت اختیار کر رکھی ہے وہ اسے کس جانب لے جائے گی؟

——— عوام کہتے ہیں کہ ایمرجنسی کے دوران کڑوا تیل چھ روپے تھا اب بارہ کیوں ہو گیا، تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے سنجے گاندھی اور ماروتی کے خلاف انکوائری کمیشن بنا دیا۔

——— عوام کہتے ہیں کہ چاول کی قیمت اتنی کیوں بڑھ گئی تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے اندرا گاندھی کی زیادتیوں کی جانچ کرانے کا فیصلہ کیا ہے

——— عوام کہتے ہیں کہ ضروری اشیاء کی قیمتیں کیوں بڑھ رہی ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے بنسی لال کے خلاف کمیشن بحال کر دیا۔

——— بہار کے عوام گرانی کی بات کرتے ہیں تو آپ للت نرائن مشرا کے قتل کی نئے سرے سے انکوائری کرانے، جے پی کے گردے بیکار کئے جانے کی جانچ کرانے، اور جگن ناتھ مشرا کے خلاف تحقیقاتی کمیشن بنانے کی بات کرتے ہیں۔

——— آپ اتر پردیش جاتے ہیں تو نرائن دت تیواری کے خلاف کمیشن بنانے کا اعلان کرتے ہیں۔

——— مدھیہ پردیش جاتے ہیں تو شیاما چرن شکلا کے خلاف تحقیقات کرانے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی یقین دہانی کرتے ہیں۔

——— کیرالا میں کرونا کرن کے خلاف، اڑیسہ میں نندنی ست پتھی کے خلاف بنگال میں سدھارتھ شنکر رے کے خلاف، راجستھان میں موہن لال سکھاڈیا کے خلاف، جموں و کشمیر میں شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر کرن سنگھ کے خلاف، آندھرا پردیش میں وینگل راؤ کے خلاف، کرناٹک میں دیوراج ارس کے خلاف اور بس جہاں آپ جاتے ہیں تحقیقاتی کمیشن بنانے کے وعدے کرتے ہیں اور عوام کو بہلاوا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء ضروریہ کی قیمتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور آپ انھیں کنٹرول نہیں کرتے بلکہ کمیشنوں کے کھلونوں سے عوام کو بہلاتے ہیں۔ آخر عوام ان کھلونے کے سہارے کب تک بہلتے رہیں گے؟ اور کچھ وزیر تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ گرانی کیوں بڑھ رہی ہے، اس طرح کا سوال ہم سے کیجئے ہی نہیں اس کی ساری ذمہ داری اندرا گاندھی پر ہے۔

ہمیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

اور یہ انداز کب تک چلے گا؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم سادگی کے پتلے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح سادہ طرز رہائش اپنائے ہیں ——— ایک بار مہاتما گاندھی سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ ٹرین کے تھرڈ کلاس میں کیوں سفر کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس سے نیچے کا کوئی کلاس ٹرین میں ہوتا ہی نہیں ہے ورنہ میں اسی میں سفر کرتا!

آپ اپنی سادگی کے حوالے یوں دیتے ہیں کہ ہم سروس پلین میں سفر کرتے ہیں حالاں کہ اس سروس پلین سے سفر کرنے میں عوام کو کس طرح ہراساں ہونا پڑتا ہے اس سے ابھی عوام واقف نہیں ہیں۔ آپ ہر جگہ جا کر یہ کہتے ہیں کہ عوام ہمارے محافظ ہیں ہمیں کسی سیکوریٹی کی ضرورت نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شہر کا دورہ ہوتا ہے تو

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سیکوریٹی انتظامات پر لاکھوں روپے صرف ہو جاتے ہیں سارے شہر کو گھیر لیا جاتا ہے۔ روک لگائی جاتی ہے۔ اور آپ ہیں کہ بھولے بھالے عوام کو فریب دیتے ہیں۔

آپ گاندھی سمادھی پر قسم کھاتے ہیں کہ ہم سادہ رہائش اختیار کر کے مہاتما گاندھی کے خوابوں کی تعبیر پیش کریں گے

لیکن بتائیے کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے وزیروں کے لئے جو ضابطہ بنایا تھا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟ کیا ہر وزیر بڑی سے بڑی کوٹھی پر قبضہ کرنے کی فکر میں نہیں لگا ہوا ہے؟ کیا ہر وزیر عیش و عشرت کے لوازمات استعمال نہیں کر رہا ہے؟ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مرکز اور ریاستوں میں ہر ممبر وزیر بننے کی فکر میں نہیں لگا ہوا ہے؟ اگر وزارت کے معنی کوئی بڑی ذمہ داری اور جواب دہی ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری سادگی عوام کو دکھانے کیلئے ہے ورنہ روش وہی ہے جو پچھلی وزارت کے وزیروں کی تھی۔ فرق یہ ہے کہ وہ سادگی اور گاندھیائی طرز رہائش کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے تھے اور آپ نے پاکی داماں کی حکایت کو اس قدر طول دیا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں شکوک پیدا ہونے لگے ہیں۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں: یہ سلطانی بھی عیاری یہ درویشی بھی عیاری

ظاہر ہے کہ گاندھیائی طرز عمل اختیار کرنے پر آپ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ آپ خواہ اس کا دم بھرتے جائیے اور اپنے طرز عمل سے اس کا مذاق بھی اڑاتے جائیے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب گاندھی جی کا بنایا ہوا ضابطہ آپ کے لئے قابل عمل نہیں ہے تو اس کا برابر ورد بھی نہ کیا جاتا۔

عوام کو سب سے زیادہ دلچسپی اس بات سے ہے کہ انھیں کھانے، پینے، پہننے اور رہنے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نیز بچوں کی تعلیم کی سہولیات کس طرح حاصل ہوں۔ اس لئے بنیادی بات یہ ہے کہ پہلے چیزوں کی قیمتوں کو قابو میں کیا جائے اور ان کی سطح کو نیچے لایا جائے نہ کہ خالی پیٹ آدمی کو درس، وعظ و پند و نصیحت کے لکچر پلائے جائیں۔ ان کے ہاتھ میں بس تحقیقاتی کمیشنوں کے کھلونے دیئے جائیں اور عوامی رقوم کا بہت بڑا حصہ اس پر برباد کیا جائے آج تک جتنے بھی انکوائری کمیشن بنائے گئے ان کا نتیجہ کیا نکلا؟ بہار میں ۱۹۶۷ء میں سنجکت وِدھائک دل کی حکومت بنی تو اس پر محض عوامی دولت برباد ہوئی اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ جن لوگوں کے خلاف الزامات ثابت بھی ہوئے ان کا کیا بگڑ گیا۔ جو لیڈر برسر اقتدار پارٹی میں چلا گیا بس وہ فرشتہ بن گیا۔ اس کے خلاف سارے الزامات بھی اٹھ گئے اور اسے نیکی کا سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔ کانگریس بھی اسی روش پر گامزن تھی اور اب جنتا کی روش بھی یہی ہے۔

ہندوستانی عوام اب بہت بیدار ہو گئے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکنے والوں کو وہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے پہلے بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں۔ تب دوسرے کاموں پر توجہ دی جائے۔ ورنہ عوام سوال کریں کہ جس کپڑے کی قیمت ایمرجنسی کے وقت ۵ روپے میٹر تھی اب آٹھ روپے کیوں ہو گئی تو آپ جواب دیں کہ ہم ٹائم کیپسول نکلوانے جا رہے ہیں جس کو دفن کرنے میں تیس ہزار روپے صرف ہوتے تھے، یہ تو بس وہی مثل ہے کہ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ"

ہاں جب انکوائری کرانے کا ہی سلسلہ چل رہا ہے تو اندرا گاندھی کے دور حکومت کی ان باتوں کی بھی جانچ کروا لینی چاہئے ——— بنگلہ دیش کی آزادی، سکم کی ہندوستان میں شمولیت، پاکستان سے شملہ معاہدہ، ہندوستان کا ایٹمی دور میں داخل ہونا، آریہ بھٹ کا خلا میں چھوڑا جانا، عربوں کے ساتھ ہندوستان کی دوستی اور پاکستان کے کھلے دوست ایران کو غیر جانبدار بنانا ——— یہ اور اسی طرح کی کامیابیاں کیونکر حاصل ہوئیں۔ کس کیوجہ سے حاصل ہوئیں؟ آخر ان کی بھی تو جانچ ہونی چاہئے۔

(فروری جولائی ۱۹۷۷ء)

CC-0. Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ آزادی جھوٹی ہے

جی چاہتا ہے کہ اس بار اداریہ کا صفحہ سادہ چھوڑ دوں! آخر کیا لکھوں؟ جدھر جاتا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں۔ جس طرف جاتا ہوں ہر جگہ بس ایک ہی ذکر ہے۔ وائے مہنگائی، ہائے مہنگائی، اُف گرانی، آہ گرانی!۔ غربت، افلاس، بھوک بیکاری، بے انصافی..... ایسی حالت میں میں یوم آزادی کے موقع پر کیا لکھوں۔ میں کوشش کر کے بھی یہ نہیں لکھ سکتا کہ فضائیں رقص کر رہی ہیں۔ ہوائیں جھوم رہی ہیں۔ لوگ گیت گا رہے ہیں، چڑیاں چہک رہی ہیں، ساز بج رہے ہیں ـــــ کیونکہ میں اگر ایسا لکھوں گا تو یہ سچائی نہیں ہوگی بلکہ اس سے بڑا جھوٹ کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔

اصلیت یہ ہے کہ ہوائیں ماتم کناں ہیں۔ گیت گانا چاہوں تو نوحے بن کر زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ چڑیوں کی آواز کانوں کو ناگوار لگتی ہے۔ اور ساز جیسے ماتمی دھن بن کر رہ گئے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آج روٹی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ روٹی جو انسان کی بنیادی ضرورت ہے اس کی دسترس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

آج ہندوستانی عوام کے غم و آلام اور مایوسیوں کی حد دا تہا نہیں ہے۔

میں جب لوگوں کے درمیان بیٹھتا ہوں تو باتیں کرتے کرتے سہم جاتا ہوں کیونکہ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ان کے منھ سے بے اختیار آہ نکل جاتی ہے جیسے انھوں نے ماضی قریب میں کوئی بہت بڑی غلطی کی ہو۔ اور اس پر سخت پشیمان و نادم ہوں۔ راستہ چلتے کچھ ایسی آوازیں سنتا ہوں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

پھر بھی جنتا سرکار کے وزراء کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ ہم نے حقیقی معنوں میں آزادی حاصل کر لی ہے۔

کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟

اگر یہ آزادی ہے تو پھر _____

اس سے کہیں بہتر تھا اسیری کا زمانہ: آزاد ہیں، اور پاؤں میں زنجیر پڑی ہے عوام کے ہاتھ غربت کی ہتھکڑیوں اور کس مپرسی کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

پھر آخر یہ آزادی کیسی ہے؟

جے پرکاش جی تو کہتے تھے کہ جنتا راج قائم ہوگا تو سب کو برابر کے حقوق ملیں گے نابرابری ختم ہوگی۔ غربت کا خاتمہ کیا جائے گا۔ مہنگائی دور کی جائے گی۔ بھرشٹاچار کو جڑ سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ذات پات اور بھائی بھتیجا واد کو پنپنے نہیں دیا جائے گا۔ اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ اور ہریجنوں پر مظالم نہیں ہوں گے۔ اور ہمارے ملک میں رام راجیہ آجائے گا۔

لیکن حقیقتاً ہو کیا رہا ہے؟

آج مہنگائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس سے قبل اتنی کبھی نہیں تھی۔ چیزوں کی قیمتیں جنتا سرکار آنے کے بعد سو فی صد سے بھی زائد بڑھی ہیں۔ اور ان پر کنٹرول کرنے میں حکومت بے بس و بے دست و پا نظر آرہی ہے۔ محض ذخیرہ اندوزوں کو وارننگ دی جاتی ہے جب مرکز کے وزیر تجارت شری موہن دھاریہ، یہ دھمکی دیتے ہیں کہ وہ ذخیرہ اندوزوں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے خلاف میسا کی کارروائی کریں گے تو ان کی ہی پارٹی کے کچھ لوگ چڑھ دوڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ شری جے پرکاش نرائن بھی انھیں لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میسا کی کارروائی کرنا وعدہ خلافی ہے۔

لیکن کیا مہنگائی کو اسی طریقے سے بڑھنے دینا اور اسے نیچے لانے کیلئے تدابیر نہ کرنا وعدہ خلافی نہیں ہے! میسا کی کارروائی محض مٹھی بھر افراد کیلئے وعدہ خلافی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی اکثریت غریب ہے۔ مگر افسوس کہ حکومت کو مٹھی بھر سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کے مفادات کی تو اس قدر فکر ہے، لیکن جنتا نے جس کی طاقت سے حکومت حاصل کی اسے یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔ جواہر لال نہرو، جو ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات کے جنم داتا تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ذخیرہ اندوزوں کو عبرتناک سزائیں ملنی چاہئیں۔ انھیں کسی قریبی درخت سے لٹکا دینا چاہئے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

لیکن ہمارے حکمراں بڑھتی ہوئی مہنگائی پر صرف خاموش تماشائی بنے رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ بڑھتی ہوئی قیمتوں پر کنٹرول کرنا حکومت کا فرض ہے۔ لیکن حکومت اپنے اس بنیادی فرض میں یکسر ناکام رہی ہے۔ ذخیرہ اندوز تو معاشرے کا کوڑھ ہیں۔ انھیں عبرتناک سزائیں ملنی چاہئیں۔ لیکن حیرت ہے کہ شری جے پرکاش نرائن بھی میسا کی کارروائی کے حامی نہیں ہیں۔ جبکہ یہ طے شدہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مان سکتے۔ یہ بات وہ خود بھی بخوبی جانتے ہیں۔ انھوں نے ۷۴ء میں مہنگائی کے خلاف مہم چلائی تھی، لیکن اب پتہ نہیں وہ اپنے فرض سے روگردانی کیوں کر رہے ہیں؟

لوگوں کو یاد ہے کہ ان کی تحریک بھرشٹاچار کے خلاف بھی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کانگریس کے دور اقتدار میں بھرشٹاچار بہت بڑھ گیا ہے۔ حالانکہ بہار میں یہ تحریک اس وقت چلی جب جناب عبدالغفور بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اور کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے سر دھڑ کی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بازی لگائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لوگ بھی ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ اسوقت شری جے پرکاش نرائن نے کہا تھا کہ "عبدالغفور ایماندار آدمی ہیں لیکن ان کے ساتھ جو لوگ ہیں، وہ ایماندار نہیں۔" آج پتہ نہیں جنتا پارٹی کے لوگوں کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟

لوگوں کو یہ بھی یاد ہوگا، اس وقت عبدالغفور نے کہا تھا کہ شری جے پرکاش نرائن آئیں میرے کندھے پر ہاتھ رکھیں میں کرپشن دور کر دوں گا۔ لیکن آج جب جنتا حکومت میں بھی کرپشن کا دور دورہ ہے شری جے پرکاش نرائن اب کیا کریں گے! شری جے پرکاش نرائن نے مہم چلائی اور "مکمل انقلاب" کا نعرہ دیکر ہٹ گئے آخر یہ "مکمل انقلاب" گیا کہاں؟ کیا یہی انقلاب ہے؟ اسے کوئی ذی ہوش آدمی "مکمل انقلاب" نہیں کہہ سکتا۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

جنتا پارٹی کے چیف شری چندر شیکھر کہتے ہیں کہ "مکمل انقلاب" کیا ہے میں جانتا نہیں شری جے پرکاش نرائن نے کبھی اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔ کبھی اس کی رُوپ ریکھا دکھائی نہیں۔ یعنی جب ملک ان کے "مکمل انقلاب" سے دوچار ہوا تو انکی پارٹی کے افراد کہتے ہیں "مکمل انقلاب" کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض خواب و خیال کی چیز تھی۔ پھر آخر اسے حقیقت میں تلاش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ خیال کو خیال ہی رہنا چاہئے۔

اقلیتوں کے خلاف ناانصافی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ انھیں نوکری میں مناسب تناسب تو کیا ملتا، سابقہ پوزیشن بھی ختم کی جا رہی ہے۔ مرکز میں چالیس میں سے ایک بھی مسلمان سکریٹری نہیں رہا۔ اردو کے ساتھ ناانصافیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جنتا پارٹی نے اپنے مینی فسٹو میں اردو کو مناسب مقام دینے کا ذکر کیا۔ اردو والے اس خوش فہمی کا شکار ہوئے کہ کانگریس جو تیس سال سے اردو کے ساتھ ناانصافیاں کر رہی ہے جنتا پارٹی اس کا تدارک کرے گی۔ مسلمانوں کے لیڈر مولانا بخاری صاحب نے یہی مسلمان کو باور کرایا تھا۔ لیکن

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اب وہ بھی فضا میں ڈنڈا لہرا کر بھول گئے ہیں کہ انھیں کیا کرنا ہے!

شری جے پرکاش نرائن نے اسمبلی الیکشن کے ٹکٹ بٹنے کے بعد کہا کہ جنتا پارٹی نے مسلمانوں اور عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، انھیں مناسب نمائندگی نہیں دی۔ لیکن ابھی جب راجیہ سبھا اور کونسل کیلئے ضمنی انتخابات ہوئے تو جنتا پارٹی نے ایک بھی مسلمان کو ٹکٹ نہیں دیا۔ حالانکہ اناڈی۔ ایم۔ کے نے ایک مسلمان ممبر راجیہ سبھا میں بھیجا۔ لیکن جنتا پارٹی ایسا کرتی ہی کیوں؟ اردو کے بارے میں جنتا وزیروں کے جو بیانات آئے ہیں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کے بعد اردو والوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انھیں جنتا پارٹی نے محض فریب دیا۔ ان کے ساتھ کھلا ہوا مذاق کیا۔

جنتا پارٹی کے افراد مہاتما گاندھی کے نام لیوا ہیں، کچھ لوگ مہاتما گاندھی کے جانشین اور ان کے چیلے ہونے کے دعویدار ہیں، باپو ہریجنوں کو عزیز رکھتے تھے لیکن جنتا حکومت میں ان کے خلاف ظلم کی آندھی چل رہی ہے۔ ہر جگہ غریب ہریجنوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ انھیں جو زمینیں دی گئی تھیں بڑے زمینداروں نے خالی کروالیں اور کھڑی فصلیں برباد کر دیں۔ مار ڈالنے اور زندہ جلانے کے متعدد واقعات ہو چکے ہیں لیکن وزیر داخلہ شری چرن سنگھ کہتے ہیں، ہریجنوں پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ ان واقعات پر شری جگ جیون رام بھی مہر بہ لب نظر آتے ہیں۔ حالانکہ جنتا پارٹی کے ہی ایک اہم لیڈر شری رام دھن نے مظالم کی تصدیق کی ہے۔ شری چرن سنگھ کہتے ہیں کہ وہ صرف بڑے کسانوں کے ہی نہیں چھوٹے کسانوں کے بھی لیڈر ہیں۔ پتہ نہیں اس کے بین السطور کیا ہے؟

لا اینڈ آرڈر کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پھر بھی حکومت کہتی ہے کہ جرائم میں کمی ہوئی ہے۔

تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام غلط کہہ رہے ہیں اور ان کے احساسات غلط ہیں یا پھر

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جنتا وزیر حالات اور حقیقت سے نظریں چرا رہے ہیں؟

شری جے پرکاش نرائن کا مطالبہ تھا کہ عوام کو منتخب نمائندوں کو واپس بلانے کا حق ملنا چاہیئے۔ لیکن اب تک اس سمت میں کون سا قدم اٹھایا گیا ہے۔ اور جنتا حکومت ایسا کرنے بھی نہیں جا رہی ہے کیونکہ یہ سب تو بس وقت وقت کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کیا تعلق! یہ خوشنما نعرے تھے جو ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ اب جے پی پتہ نہیں عوام کے درمیان آکر گاندھی میدان کے جلسے میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کیوں نہیں کرتے؟ آخر جنتا پارٹی کے جنم داتا تو وہی ہیں۔ مکمل انقلاب کے خالق تو وہی ہیں۔

جنتا پارٹی میں شامل سوشلسٹ، اور گاندھی وادی اپنی ہی کسوٹی پر بری طرح کھوٹے اترے ہیں۔

شری ہیم وتی نندن بہوگنا جو پہلے مسلمانوں کے درمیان کسی مسلم لیڈر سے زیادہ مقبول تھے اب اپنی کشش کھوتے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کا اعتماد ان پر سے اٹھتا جا رہا ہے کیوں کہ وزیر اعظم کے اس اعلان پر انھوں نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اردو کے بارے میں اب تک کابینہ یا پارٹی کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہوا اس لئے وزیر اعظم کی رائے ان کی ذاتی رائے ہے۔ نیز وہ اب بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے حامی ہیں۔ اور اس کے لئے لڑیں گے۔ لیکن وزیر داخلہ نے پارلیامنٹ میں پالیسی بیان دے کر آخری مہر لگا دی۔ کہ اردو دوسری سرکاری زبان نہیں بن سکتی پھر پتہ نہیں بہوگنا صاحب اردو والوں کو ایسا فریب کیوں دیتے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ وزیر اعظم یا دوسرے وزراء اردو کو اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اسے کابینہ یا پارٹی کی عاملہ کے سامنے پیش بھی کیا جائے۔

اب بہوگنا صاحب بھی مہر بلب ہیں۔ بس ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہو جاتے ہیں۔

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

اب ہنسی آئے بھی تو کیسے؟ عوام کی آنکھوں میں تو آنسو ہی آنسو ہیں اور انھیں خشک کرنے کیلئے جنتا کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے پارلیامنٹ ہاؤس کے دروازے پر ننھے ننھے بچوں کو بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ ہماری آزادی آج بھی لباس سے عاری ہے۔ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ جمہوریت کے منہ پر ایک ضرب لگا دیتے ہیں اور ان کو نظر انداز کر کے ہمارے سب سے اونچے ایوان کے ممبران گزر جاتے ہیں۔ وہ کاروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور ان تک بے چارے مجبور و مفلس عوام کی پہونچ نہیں ہو سکتی۔

کیا مرارجی بھائی نے فٹ پاتھوں، گندی، میلی کچیلی گلیوں، کھولیوں میں رہنے والے انسانوں کو دیکھا ہے۔ جن کی زندگی جانور اور بلبلاتے کیڑوں سے بھی بدتر ہے۔ انکے بچے گندی نالیوں میں اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں، جھوٹے پتل چاٹتے ہیں اور کس مپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ کاش وزیر اعظم انھیں دیکھنے کی زحمت کرتے تو شاید انھیں مہنگائی پر قابو پانے کا خیال آتا۔ ان افلاس زدہ عورتوں کے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا نہیں ہے اور وہ غیرت سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ انھوں نے سورج نہیں دیکھا ہے۔ ان کیلئے صبح کا ابھرنے والا سورج تاریکی کا منبع ہے۔ یہ ہماری آزادی کی برہنگی اور افلاس کی علامت ہیں۔ پھر آج آزادی کیسی؟

جنتا حکومت سے عوام کی امیدیں بہت وابستہ تھیں اسی لئے عوام کے دکھ بھی بے پناہ ہیں۔ جنتا کے لیڈروں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنے وعدے پورے کرنے میں ناکام رہے تو باپو کے جنم دیوس ۲ر اکتوبر ۷۷ء کو واپس جنتا کے درمیان آجائیں گے۔ ابتک تو

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انھوں نے کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ پتہ نہیں اس وعدے میں صداقت کہاں تک ہے؟ ورنہ ہندوستان میں ہر روز مہاتما گاندھی کو قتل کیا جاتا ہے! آخر مہاتما گاندھی کا نام لے کر ان کے آدرشوں کی نفی کرنا، ان کا قتل کرنا ہی تو ہے؟

ابھی تو مایوسیوں کی کالی رات ہے۔ ابھی آزادی کیسی؟

جب غربت، افلاس، نابرابری، چھوا چھوت کرپشن اور مہنگائی سے نجات ملے گی تو آزادی کا سورج طلوع ہوگا ——————

جب ہر ہاتھ کو کام ملے گا، ہر پیٹ میں روٹی ہوگی، ہر بدن پر کپڑا ہوگا تب آزادی کا اجالا پھیلے گا ——————

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

۱۴ اگست ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

باپو کی ہتیا ایک بار پھر

۲ر اکتوبر مہاتما گاندھی کی پیدائش کا دن ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کا بہت اہم دن ——— !

لیکن میں چاہتا ہوں کہ دو اکتوبر اس سال نہ آئے۔ شاید حکمراں جماعت کے بہت سے لیڈران بھی یہ چاہتے ہوں ———

جنتا پارٹی کے ممبران پارلیامنٹ نے الیکشن جیتنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر شری جے پرکاش نرائن واچاریہ کرپلانی کی رہنمائی میں پانچ نکاتی حلف لیا تھا جس میں یہ عہد کیا گیا کہ وہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو اپنائیں گے سادگی اختیار کریں گے اور ملک کی تعمیر کیلئے کام کریں گے۔

کچھ رہنماؤں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ۲ر اکتوبر تک جنتا پارٹی نے اپنے وعدے پورے نہ کئے تو وہ عوام کے درمیان آجائیں گے کیوں کہ وہ استعفے جیب میں لیکر جا رہے ہیں۔

جنتا پارٹی نے حکومت سنبھالنے کے بعد مہاتما گاندھی کے اس مضمون کی اشاعت کی تھی جس میں انہوں نے گورنر اور وزراء کی طرز زندگی کیلئے ایک ضابطہ تیار کیا تھا۔

اس لئے میں نے کہا، میں چاہتا ہوں کہ ۲ر اکتوبر اس سال نہ آئے ——— مجھے پورا یقین ہے کہ جنتا پارٹی کا کوئی بھی رکن اسمبلی یا پارلیامنٹ سے مستعفی ہو کر عوام کے درمیان نہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

آئے گا حالانکہ عوام سے کیا گیا کوئی وعدہ اب تک پورا نہیں ہوا۔ سب سے بنیادی مسئلہ روٹی ہے جو روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ روٹی مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔

جنتا پارٹی کے وزراء نے مہاتما گاندھی کے ضابطہ کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے کیوں کہ کسی بھی وزیر نے سادہ رہن سہن اختیار نہیں کیا۔ وہ ان کوٹھیوں میں براجمان ہیں جن میں کانگریسی شہزادے رہتے تھے جن کی یہ لوگ پرزور مذمت کیا کرتے تھے۔ ان کی طرز رہائش پر تنقیدیں کرتے تھے۔ سنا تو یہاں تک گیا ہے کہ کچھ وزراء نے اپنے ڈرائینگ روم سجانے پر لاکھوں روپے صرف کئے ہیں۔ ایک وزیر نے تو یہاں تک کہا کہ رہائش سے کیا ہوتا ہے دل سے تو ہم لوگ غریبوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ رہائش کسی بھی طرح کی ہو۔ عوام کا خیال دل میں رہنا چاہئے پتہ نہیں کیوں اس پر مجھے اکبر آبادی کا شعر یاد آگیا۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ:۔ رنج لیڈر تو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

اس طرح سے مہاتما گاندھی کے ضابطے کی دھجیاں اڑ گئیں۔

جنتا راج میں تو آر ایس ایس کو بھی خوب پھیلنے پھولنے کا موقع مل رہا ہے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مہاتما گاندھی کا ہتیارا ناتھورام گاڈسے آر ایس ایس کا سرگرم رکن تھا۔ آر ایس ایس کے ہاتھوں مہاتما گاندھی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں یہ بھی خبر آئی کہ پونا میں گاڈسے زندہ باد کے نعرے لگائے گئے یعنی اب مہاتما گاندھی کا قاتل بھی ہیرو ہو گیا۔

شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہے جب ہریجنوں پر مظالم کی کوئی خبر نہ آتی ہو۔ اس پر بھی شری جگ جیون رام کا کہنا ہے کہ جتنی خبریں آتی ہیں ہریجنوں پر ان سے کہیں زیادہ مظالم ہو رہے ہیں۔ یعنی مہاتما گاندھی نے جنہیں ہریجن بنایا وہ پھر سے اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مہاتما گاندھی کی قاتل آر ایس ایس کے کئی سرگرم

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ممبران بھی وزارت کی کرسی پر بیٹھ گئے ہیں ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو مہاتما کے قتل کے کیس میں ملوث تھے۔ انہیں اس قتل پر کوئی شرمندگی بھی نہیں بلکہ وہ تو اب راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ ہونے کا فخریہ اعلان کرتے ہیں۔

اس پر بھی رام گھاٹ جا کر مہاتما گاندھی کی سمادھی پر حلف لینا مضحکہ خیز حرکت نہیں کہا جائے گا تو پھر اسے اور کون سا نام دیا جائے گا؟

جنتا پارٹی کے ایک مہان نیتا نے تو یہاں تک کہا کہ ـــــ مہاتما گاندھی بھی سرمایہ داروں سے پیسے لیا کرتے تھے۔

کل آر ایس ایس نے محض مہاتما کے سینے میں گولیاں اتاری تھیں لیکن آج ان کے نظریات اور آدرشوں کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔

شاید اسی لئے تو سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں روزانہ مہاتما گاندھی کا قتل ہوتا ہے ـــــ اپنے محسن کو فراموش کرنے کی اس سے بدترین مثال شاید ہی دنیا میں کوئی اور مل سکے۔

میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنتا پارٹی کے ایک وزیر میں بھی یہ غیرت و حمیت نہیں کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق بابائے قوم کے یوم پیدائش پر جنتا میں آتے کیوں کہ پارٹی نے عوام سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کیا اور آج عوام کے دکھ اور مایوسی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن اب کسی کو اپنا وعدہ یاد نہیں رہا ـ کیونکہ اس کا اپنا مقصد تو پورا ہو گیا جیب میں پڑا ہوا استعفےٰ نامہ تو کب کا پرزے پرزے ہو چکا ہوگا۔ جس طرح بابائے قوم کے نظریات پرزے پرزے ہو گئے۔

مہاتما کی سمادھی پر حلف لینے کے بعد جنتا حکومت کے وزراء اور رہنماؤں نے اپنے طرز عمل سے جس طرح ان کے نظریات اور آدرشوں کا مذاق اڑایا ہے وہ تاریخ کا ایک

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

المناک حادثہ ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

کیا بابائے قوم کے یوم پیدائش پر جنتا حکومت آکر عوام سے نظریں ملا سکتی ہے؟

اسی لئے میں چاہتا تھا کہ ۲ اکتوبر اس سال نہ آئے ——!

۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اقبال جو ہندوستانی نہیں تھے!

علامہ اقبالؒ کی پیدائش کو سو سال ہو گئے دنیا کے بہت سے ممالک میں انکی یاد دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ ان کی تصانیف کے تراجم ہو رہے ہیں۔ ان کا پیام عام کیا جا رہا ہے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سمینار، سمپوزیم، اور مشاعرے ہو رہے ہیں۔ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اور خاص نمبر شائع کئے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبال بلاشبہ ایک عظیم شاعر، فلسفی، مفکر اور دانشور تھے۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور متحدہ ہندوستان میں دفن بھی ہوئے۔ انھوں نے ساری زندگی ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے۔ ہندوستانی ہونے پر فخر کیا اور قومی یکجہتی پر ایک دو نظمیں نہیں بلکہ درجنوں نظمیں لکھیں۔ خوب ڈوب کر لکھیں۔ ہندی لے میں وہ نغمات سرمدی سناتے رہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ وطن پرستی کے آداب سکھائے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

انھوں نے وطن کی خاک کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کی اور قومی یکجہتی کا درس دیا۔ عالم انسانیت کو امن کا پیغام دیا اور اپنے دیش باسیوں کو محبت کا سبق پڑھایا۔

سکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے ۔ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

انھوں نے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر اس قومی ترانہ کی تخلیق کی جو بچہ بچہ کی زبان

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

پر آگیا۔ کیونکہ اس میں محض وطن کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں تھا پریم کا درس تھا خلوص تھا۔ اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ∴ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

انھوں نے قومی ایکتا کے جذبات کو فروغ دینے کیلئے گوتم، رام، کرشن، گرونانک اور گاندھی پر بھی نظمیں لکھیں۔ اقبال ایک ہندوستانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانیت جاری وساری ہے۔ لیکن وہ ایک ایسے فنکار تھے جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اسی لئے وہ محض پنجاب، کشمیر یا صرف ہندوستان کے شاعر نہیں تھے۔ وہ صرف فارسی وار دو کے شاعر نہیں تھے ان کی شاعری جہاں زمان ومکان کی گرفت سے آزاد تھی وہیں زبان وعلاقہ اور مذہب کی بھی اسیر نہیں بن سکی۔ اس کی حیثیت آفاقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں آج ان کی یاد ساری دنیا میں منائی جارہی ہے تو اس میں کچھ بھی عجیب بات نہیں ہے البتہ مجھے جس بات پر تعجب ہے وہ یہ کہ ہندوستان جہاں وہ پیدا ہوئے جس کی عظمت کے گیت گائے وہیں انکی یاد شایان شان طور پر نہیں منائی جارہی ہے۔

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کا تعلق کانگریس یا جنتا پارٹی سے نہیں تھا۔ وہ اول تا آخر ایک فنکار تھے۔ ایک تخلیق کار تھے، ایک شاعر تھے ایک دانشور تھے۔ انھوں نے آنے والی نسلوں کو بہت کچھ دیا۔ انھوں نے پوری قوم کو متاثر کیا یہ ساری دنیا ان کی خدمات کا اعتراف کر رہی ہے لیکن ہم نہیں کر رہے ہیں ایسا کیوں ہے؟ کیا ہم ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جہاں تخلیق کار کی کوئی عزت نہیں کوئی وقعت نہیں۔ حالانکہ ہم ادب کے پرستار ہونے کے بلند بانگ دعوے بھی کرتے ہیں۔ ادبی شخصیتوں کو بلند مقامات دینے کے بھی دعویدار ہیں لیکن یہ بات حقیقت سے کچھ میل نہیں کھاتی ہم اقبال کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے ان کے خیالات سے استفادہ نہیں کرتے تو اس میں بھلا ان کا کیا نقصان ہے؟ اس میں تو سراسر ہمارا اپنا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زیاں ہے کہ ہم ایک اہم اور قومی سرمائے سے دستبردار ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں نہ صرف اپنے یہاں کے فنکاروں کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے بلکہ دوسرے ممالک کے اہم فنکاروں کی بھی خدمات کا اعتراف مختلف شکلوں میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ علامہ اقبال جیسے بے بدل شاعر کی خدمات کے اعتراف میں ہندوستانی محکمۂ ڈاک و تار نے اقبال صدی کے موقع پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ سابقہ حکومت نے علامہ اقبال کا ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ چھپا ہوا ڈاک ٹکٹ ضائع کر دیا گیا۔ کیا کچھ تنگ نظر ایسا کر کے کسی عظیم شاعر کی وقعت کم کر سکتے ہیں؟

شاید یہی کہ علامہ اقبال اردو کے شاعر تھے یا پھر یہ کہ وہ مسلمان تھے؟ لیکن یہ دونوں باتیں ٹکٹ نہ شائع کرنے کا جواز نہیں بن سکتیں۔ اردو اس ملک کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد ہندوستان میں تین کروڑ سے زیادہ ہے۔ مسلمان اس ملک میں دس کروڑ کی تعداد میں ہیں۔ اور انھیں بھی برابر کے حقوق حاصل ہیں پھر آخر اقلیت کی اس طور سے دلآزاری کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کا ٹکٹ شائع کر دینے سے کوئی آسمان سر پہ نہیں ٹوٹ پڑتا اور نہ قیامت آجاتی۔ اس سے اقلیتوں کا حکومت پر اعتماد ہی بحال ہوتا۔ انھیں احساس ہوتا کہ جنتا حکومت بھی ان کے جذبات کا احترام کرتی ہے ـــــ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ شاعر مشرق کے ساتھ اس معاندانہ رویہ کی وجہ کیا ہے کچھ پتہ نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے قومی و تہذیبی ورثے کو اس طور پر فراموش کرتے جا رہے ہیں۔

حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ اقبال صدی کے موقع پر سارے ہندوستان میں سرکاری سطح پر ان کا جشن شایان شان طور پر منایا جاتا اور ان کی مستقل یادگار قائم کی جاتی لیکن

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

افسوس کہ حکومت کی سرد مہری نے اردو والوں کی اس خواہش پر اوس ڈالدی۔

میں ایک اردو داں، اردو صحافی اور اقبال کا پرستار ہونے کے ناطے حکومت کے اس رویے پر احتجاج کرتا ہوں اور پھر درخواست کرتا ہوں کہ حکومت ٹکٹ شائع کرنے کے معاملے پر اب بھی نظر ثانی کرے۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جمہوریت کی کامیابی کا پتہ اس بات سے لگانا چاہیئے کہ ملک کی اقلیتیں حکومت سے مطمئن ہیں یا نہیں لیکن یہاں تو آئے دن دلآزاری کے سامان ہو رہے ہیں۔ ؎

اور ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

۶ر نومبر ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تہمت ہے مختاری کی؟

یکم نومبر کو دہلی میں اردو گھر کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے جو کچھ ارشاد فرمایا اسے پڑھ کر کم از کم اردو داں اقلیت کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ ان کی یہ تقریر ہر محب اردو کیلئے دلآزار تو ہے ہی لیکن ان لوگوں کے منہ پر ایک کرارا تھپڑ ہے۔ جو جنتا پارٹی میں رہ کر اردو کے بارے میں اس سے انصاف کے طلبگار ہیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے دوسری سرکاری زبان بنوانے کے خواب دیکھ کر یا تو محض خود کو بیوقوف بنا رہے ہیں یا پھر اردو عوام کو فریب دے رہے ہیں۔

شری مرارجی ڈیسائی کا اردو مخالف رویہ کوئی نیا نہیں ہے انھوں نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے مسلم لیگ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اردو کیلئے دیوناگری رسم الخط اختیار کرے۔ اس نے یہ مطالبہ نہیں مانا اسی وجہ سے ان کی ہمدردی اس سے کم ہو گئی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اردو کے تئیں ان کا معاندانہ رویہ کوئی نیا نہیں ہے لیکن اردو کو یہ قیمتی مشورہ دینے والے وہ کون ہیں؟ اور ان کے مشورے پر عمل نہ کر کے اردو والے خودکشی کرنے کو تیار نہیں ہوئے تو ان کی ہمدردی اردو سے کم ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ نیک مشورہ گجراتی، مراٹھی، تیلگو، ملیالم یا بنگلہ زبانوں کو کیوں نہیں دیا۔ محض اردو ہی کو کیوں؟ اور آخر اردو کو موجودہ رسم الخط کے ساتھ جینے کی اجازت کیوں نہیں ہے حقیقت

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ ہے کہ اردو الفاظ کیلئے دیوناگری رسم الخط قطعی ناقص ہے۔ اگر ان کے اس مطالبے کو مسلم لیگ والے مان بھی لیتے تو کم از کم اسے اردو عوام تسلیم نہیں کرتے۔ کوئی اتنی آسانی سے خودکشی نہیں کرتا۔

شری مرارجی ڈیسائی نے اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی قیمتی باتیں کہیں ——— اردو کو آسان بنایا جائے ورنہ اس کا حشر سنسکرت جیسا ہوگا کہ جس کے پاس اتنا قیمتی ادب کا سرمایہ تھا لیکن وہ عوامی زبان نہیں بن سکی۔۔۔ مہاتما گاندھی بھی چاہتے تھے کہ اردو رسم الخط دیوناگری ہو۔۔۔ اردو کو فرقہ وارانہ عناصر سے پاک کیا جائے وغیرہ وغیرہ

وزیر اعظم کی لاعلمی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کیونکہ اردو ایک آسان زبان ہے اور اپنی سلاست کے بل پر ہی زندہ ہے اس کے باوجود کہ اس کو تیس سال سے مسلسل کچلا جا رہا ہے۔ کئی صوبوں سے نکال باہر کیا گیا بے گھر کیا گیا بے سہارا کیا گیا اسکے باوجود یہ زندہ ہے۔ کیا وہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ وہ فلمیں جن کا سرٹیفکٹ 'ہندی' کا ہوتا ہے اس کے سارے کے سارے ڈائیلاگ اردو میں ہوتے ہیں۔ کوئی بھی انصاف پسند فلمیں دیکھ کر میرے دعوے کی تصدیق کر سکتا ہے۔ یہانتک کہ سیاسی مقرر اپنی تقریر میں زور پیدا کرنے کیلئے اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، کس زبان کے اشعار پڑھتے ہیں، اور روزانہ لاکھوں زبانوں سے ادا ہونے والا نعرہ، انقلاب زندہ باد، کس زبان کا ہے، اگر وہ واقعی انصاف پسند ہوتے تو وہ فلم سازوں یا سنسر بورڈ کو سرزنش کرتے کہ اردو فلموں کے سرٹیفکٹ میں ہندی کیوں لکھا ہے ڈائیلاگ اور گانے سب اردو میں ہوں اور اسے ہندی کہا جائے یہ اچھا مذاق ہے اردو کی سلاست اور مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ابھی سرکاری زبان ہندی کو اس سے بہت کچھ لینا ہے کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ 'ہندی' نے حال ہی میں اس سے 'غزل' لی یہ الگ بات ہے کہ ہندی میں جو غزلیں کہی جا رہی ہیں وہ اردو کے گھٹیا شاعر کی غزلوں سے بھی گئی گذری

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں۔ ایسا اردو سے لاعلمی کی وجہ سے ہی ہو رہا ہے۔

یہ کہہ کر شری مرارجی ڈیسائی نے مہاتما گاندھی کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اردو کیلئے دیوناگری رسم الخط چاہتے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس سے قبل سب لوگ یہی جانتے تھے کہ وہ ہندوستانی کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے جسے اردو و دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھا جائے اور وہ خود اس اصول پر عمل پیرا تھے انھوں نے ہمیشہ ہندی اور اردو کو برابری کا درجہ دیا وہ اسطرح کا امتیاز برتنا نہیں چاہتے تھے کم از کم گاندھی جی کے بارے میں اردو والوں کا اب تک خیال یہی رہا ہے۔

لگے ہاتھوں انھوں نے اردو پر یہ بھی الزام لگا دیا کہ اس میں فرقہ وارانہ عناصر ہیں حالانکہ یہ بات بالکل بعید از حقیقت ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اردو ہمارے سیکولرزم اور قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ مختلف مذاہب کی متبرک کتابیں اس میں شائع ہوئی ہیں آج بھی اردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں میں ۵۰ فیصد تعداد غیر مسلموں کی ہے۔ اردو کبھی کسی کی مذہبی زبان نہیں رہی ہے۔ یہ ہمارے سیکولرزم کی زبان ہے رواداری کی زبان ہے اور سو فیصد ہندوستانی ہے۔ اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے سے بڑا کوئی اتہام نہیں ہو سکتا۔ اس سے بڑی کوئی توہین نہیں ہو سکتی ہاں! اقلیتوں کی دلآزاری کرنا ہی مقصود ہو تو اور بات ہے حالانکہ جمہوریت کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے کہ ملک کی اقلیتوں کو مطمئن کیا جائے نہ کہ اس کے جذبات مجروح کئے جائیں اور وہ بھی سربراہ حکومت کی جانب سے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ۔:۔ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہے ہم عبث بدنام کیا

میرا خیال ہے اردو والوں کی اس طرح سے توہین و دلآزاری اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کے دور میں بھی نہیں۔ اردو کی خدمات کو فراموش کرنا تاریخ کو جھٹلانا ہے ہاں! اردو میں فرقہ واریت کے معنی کچھ اور ہیں تو میں نہیں جانتا البتہ شری ڈیسائی کا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اشارہ پاکستان کی جانب ہے تو بھی یہ الزام درست نہیں پاکستان کے بانی مرحوم محمد علی جناح انھیں کی ریاست سے متعلق تھے اور ان کی مادری زبان اردو نہیں بلکہ گجراتی تھی۔ وہ نہ اردو لکھتے پڑھتے تھے اور نہ بولتے تھے تقسیم ہند کے سارے معاہدے یا معاملات اردو کے بجائے انگریزی میں ہوئے۔

اس لئے فرقہ واریت کا الزام سراسر اردو والوں کی توہین کے برابر ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے اس کا مقصد تین کروڑ اردو دانوں کی دلآزاری کے سوا اور کچھ نہیں۔

البتہ اردو کے بارے میں شری ڈیسائی کے جو خیالات ہیں وہ کچھ نئے نہیں ہیں وزیر اعظم ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے یہ کہا تھا کہ اردو ہندوستان کے کسی علاقے کی سرکاری زبان نہیں بن سکتی۔ پھر پتہ نہیں کس وجہ سے انھوں نے ترمیم کرتے ہوئے یہ بات کہہ دی کہ کوئی ریاست کو اردو کو سرکاری زبان بنائے تو انھیں اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہوگی۔ لیکن اب اتنے دنوں بعد وہ پھر اردو کے بارے میں بولے تو بالآخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

یکم نومبر کو وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے 'اردو گھر' کے افتتاحی جلسے میں اردو کے خلاف جو تقریر کی اس پر لے دے ہو رہی تھی کہ وزیر داخلہ بھی اردو پر برس پڑے وہ بھلا کہاں پیچھے رہنے والے تھے اور محض برسے ہی نہیں بہتان طرازی ہی نہیں کی بلکہ ہذیان گوئی پر اتر آئے۔

وزیر داخلہ شری چرن سنگھ کا ایک انٹرویو انگریزی ہفتہ وار 'سنڈے' میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے مسٹر ایم جے اکبر کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ میں ہرگز اردو دشمن نہیں ہوں۔ میں خود خالص اردو بولتا ہوں اور اردو کے متعلق میں جلد ہی وزیر اعظم سے بات کروں گا۔ لیکن اس کے فوراً بعد معاصر 'بلٹز' میں ان کا انٹرویو شائع ہوا تو انھوں نے خود ہی اپنی اردو نوازی کا بھرم کھول دیا انھوں نے اردو کے خلاف جو کچھ کہا میرا خیال ہے کہ اس سے قبل نہ کسی جن سنگھی نے کہا تھا اور نہ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھی نے۔ اردو کے بارے میں ان کے ارشادات ان کی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں اور ان کے عزائم کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے وزیر اعظم سے اردو کے بارے میں بات کرنے کی جانب جو اشارہ کیا اس کا مطلب کیا ہے؟ اب سنئے ان کے ارشادات ——— اردو ملک کی تقسیم کی ذمہ دار ہے۔ اردو مستقل بٹوارے کی زبان ہے۔ ۸۵ فیصد ہندو اردو کو دوسری سرکاری زبان بننے نہیں دیں گے۔ اردو کا ناتہ ایک مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ اردو کو منگولوں اور ترکوں نے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوستان پر مسلط کیا۔ تلنگانہ پر نظام نے زبردستی اردو مسلط کی . . . ."

بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ

یہ ہیں اردو کے بارے میں چودھری چرن سنگھ کے ارشادات جن کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ بڑے صاف ذہن اور سیکولر مزاج رکھنے والے سیاستداں ہیں۔ اسی انٹرویو میں انھوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ بھی کہا جائے گا کہ "چرن سنگھ فرقہ پرست ہے"۔ دراصل یہ بات ان کے دل کے چور نے کہی ہے کیوں کہ ان کے مندرجہ بالا ارشادات کی روشنی میں انھیں کوئی سیکولر یا صاف ذہن نہیں کہہ سکتا اردو کے خلاف ان کی ہذیانیت فرقہ وارانہ ذہن کی جانب اشارہ کرتی ہے اور اسطرح کی باتیں کوئی فرقہ پرست ہی کہہ سکتا ہے۔

اردو پر ملک کی تقسیم کروانے کا الزام غلط، بے بنیاد، لچر، پوچ اور بیہودہ ہے۔ ملک کی تقسیم اردو نے نہیں کروائی اسی فرقہ وارانہ ذہنیت نے کروائی تھی جو ایک بار پھر سر اٹھا رہی ہے۔ آدمی سب کچھ جھٹلا سکتا ہے۔ لیکن تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ملک کی تقسیم فرقہ وارانہ سیاست ذہنی تنگ نظری اور انگریزوں کی حکمت عملی نے کروائی۔ اس بات کی تردید خود شری چرن سنگھ کے اس بیان سے ہو جاتی ہے کہ مہاتما گاندھی نے مسٹر جناح کو مسلمانوں کا سب سے اہم نمائندہ اور لیڈر نہ تسلیم کر کے یا ان کی باتوں پر نہ عمل کر کے غلطی کی تھی۔ تو پھر تقسیم کی ذمہ داری اردو پر کس طرح عائد ہوتی ہے۔ پاکستان میں تو پنجابی، گجراتی اور سندھی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں جو بشمول اردو ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ زبانیں ہیں۔ کیا ہم اسلئے گجراتی، سندھی اور پنجابی کو ملک بدر کر دیں گے کہ یہ زبانیں پاکستان میں بھی بولی جاتی ہیں؟ کیا ہم ان ساری باتوں کو اپنے ملک سے نکال دیں گے جو ہندو پاک میں مشترک ہیں؟

بنگلہ دیش کو پاکستان سے اس کے سیاسی و جغرافیائی حالات نے الگ کروایا اردو نے نہیں۔ اس جنگ میں اردو کا کوئی رول تھا ہی نہیں۔ اس لئے ملک کی تقسیم در تقسیم کا الزام

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اردو پر عاید کرنا شرارت انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔

شری چرن سنگھ نے یہ کہہ کر ۸۵ فیصد ہندوار دو کو دوسری سرکاری زبان بننے نہیں دیں گے۔ اردو کو مذہب سے جوڑنے کی شرارت انگیز کوشش کی ہے کیا شری چرن سنگھ اس بات سے ناواقف ہیں کہ اردو آغاز سے ہی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ آج بھی اردو کے پچاس فیصد شاعر ادیب اور صحافی ہندو ہیں۔ کیا کرشن چندر مسلمان تھے؟ کیا فراق گورکھپوری مسلمان ہیں؟ کیا آنند نرائن ملا مسلمان ہیں؟ کیا شری رنبیر مسلمان ہیں؟ یہ اردو کی عمارت کے مضبوط ستون ہیں۔ اور بقول خود شری چرن سنگھ اگر وہ خالص اردو بولتے ہیں تو کیا وہ مسلمان ہیں؟ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور زبان کو مذہب کے ساتھ جوڑنا ایک خطرناک ذہنیت کا غماز ہے۔ ۸۵ فیصد ہندو کہہ کر کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اردو مسلمان کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے؟ کیا دنیا میں آج تک زبان کا بھی کوئی مذہب ہوا ہے؟ وزیر داخلہ کی حیثیت سے شری چرن سنگھ کا یہ فرض ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں۔ جذبات کے دھارے میں بہہ کر اردو اور مسلمانوں کو مطعون نہ کریں۔ ملک کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے ان کے کاندھے پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اس ملک میں ہندو بھی رہتے ہیں، مسلمان بھی، سکھ بھی، عیسائی بھی۔ اور بہت سے مذاہب کے ماننے والے بھی۔ وزیر کی حیثیت سے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ غیر ذمہ دارانہ بیانات دینے سے باز آجائیں۔ اقلیت کی اس طرح دلآزاری نہ کریں۔ جمہوریت میں اکثریت کا یہ فرض ہے کہ وہ اقلیت کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اس کا اعتماد حاصل کرے اور اسے اپنے اعتماد میں لے۔ اس طرح کی ہذیان گوئی کر کے کیا وہ تین کروڑ اردو اقلیت کے جذبات مجروح نہیں کر رہے ہیں تین کروڑ افراد معمولی نہیں ہوتے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور مسلمان تو اس ملک میں دس کروڑ ہیں اگر وہ مسلمانوں کے جذبات پر چھری چلاتے ہیں تو اس ملک کی سب سے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بڑی اقلیت کے احساسات کو پامال کرتے ہیں۔

جنتا حکومت کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے اردو کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ اردو کے تئیں ان کا رویہ منفی ہے لیکن ۱۰ نومبر کو رانچی میں ہونے والی یونیورسٹی اردو ٹیچرس کانفرنس میں بہار کے وزیر تعلیم ثانوی جناب غلام سرور صاحب نے جو تقریر کی وہ طرفہ تماشہ ہے۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کے ارشادات کی روشنی میں یہ تقریر محض بے معنی ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے اردو والوں کے درمیان ان کا یہ آکر کہنا کہ صبر سے کام لیں سب ٹھیک ہو جائے گا ایسا ہی ہے جیسے جلتے ہوئے مکان میں پھنسے لوگوں سے یہ کہا جائے کہ سب ٹھیک ہے ان حالات میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی بات کہنا اردو والوں کے زخم پر نمک پاشی کرنا ہے۔ غلام سرور صاحب کا فرض ہے کہ جنتا حکومت کے وزیر ہونے کے ناطے پہلے وہ جنتا حکومت کے وزراء کو رام کریں انھیں سمجھائیں کہ وہ اردو اقلیت کی دلآزاری کرنے سے باز آجائیں۔ شری مرارجی ڈیسائی اور چودھری چرن سنگھ سے گفت وشنید کر کے انھیں راہ راست پر لائیں اس کے بجائے اردو والوں کے سامنے آکر جادو بیانی کرنا اور وعدے کرنا فراریت کی دلیل ہے۔ یہ وعدے ویسے ہی کھوکھلے ہیں جیسے کہ کانگریسی دور کے تھے لیکن ان میں ایک بڑا فرق بھی ہے جیسا کہ غلام سرور صاحب کے اعزاز میں دیئے گئے دہلی کے ایک جلسے میں اردو کے قدیم و بیباک صحافی جناب گوپال متل نے کہا " وہ ہمیشہ کانگریس کے مخالف رہے ہیں لیکن چھ ماہ کی جنتا حکومت کے دوران انہوں نے محسوس کیا ہے کہ جنتا حکومت کے رہنما اور وزراء جس طرح سے اردو کے خلاف دلآزار اور ہتک آمیز بیانات دے رہے ہیں ایسا کانگریس کے دور میں کبھی نہیں ہوا۔ غلام سرور صاحب کو چاہئے کہ کم از کم بہار کی سطح پر وہ اپنی ہی کابینہ کے وزیر شری کیلاش پتی مشر کو سمجھائیں کہ وہ اردو کے بارے میں ان کے بیانات کی تردید نہ کریں اور ایسا کئے بغیر ان

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کا اردو عوام کے درمیان آکر جذباتی تقریر کرنا یا بیان دینا بے معنی اور لاحاصل ہے۔ عوام کو گمراہ کرنا اور اندھیرے میں رکھنا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جنتا حکومت مسلسل اردو والوں کی دلآزاری کر رہی ہے اردو والوں کے زخم پر نمک پاشی کر رہی ہے۔ مرہم رکھنے کی کوشش ایک بار بھی نہیں کی۔

انہیں حالات سے دل برداشتہ ہو کر شاہی امام سید عبداللہ بخاری نے بالکل اسی طرح علم بغاوت بلند کر دیا ہے جس طرح انھوں نے کانگریس حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف بلند کر دیا تھا لیکن آج جنتا پارٹی کے کچھ بے ضمیر نام نہاد لیڈران ان پر اشتعال انگیزی کرنے کا الزام لگا رہے ہیں حالانکہ آج تو وہ خود زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

جنتا پارٹی کو برسر اقتدار لانے کیلئے انھوں نے کیا نہیں کیا لیکن آج جب جنتا پارٹی کے لیڈران اقلیتوں کے خلاف اس طرح کی اشتعال انگیزی کر رہے ہیں تو ان کا احتجاج درست ہے یا نہیں؟

وزیر داخلہ نے تو تمام جمہوری روایات کو بالائے طاق رکھ کر اردو والوں کے خلاف اشتعال انگیزی کی ہے بہتان طرازی کی ہے اور اردو والوں کو یہ احساس دلانا چاہا ہے کہ ان کی حقیقت اس ملک میں دو نمبر کے شہری سے بھی کم تر ہے۔ ہر جمہوریت پسند کو اس ذہنیت کی مذمت کرنی چاہئے اور ایسے وقت میں بجائے زخموں پر مرہم رکھنے کے کوئی آکر کہے کہ اردو دوسری سرکاری زبان بن رہی ہے تو یہ بات نمک پاشی کے مترادف ہی کہی جائے گی۔ تخت اور تختہ دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتے۔ اگر جنتا پارٹی کے اردو داں وزیروں میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلا سکتے ہیں تو وہ پہلے منہ زور گھوڑوں کو رام کریں۔ ورنہ خاموشی سے کرسی کا لطف اٹھاتے رہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

لیکن یہ جان لیں کہ اردو والوں کی دلآزاری اور یہ اشتعال انگیزی بہت مہنگی پڑے گی۔ کل تک یہی رہنما کہا کرتے تھے کہ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے سارے دکھوں کی ذمہ دار کانگریس ہے۔ لیکن یہ خود برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ساری اعلیٰ روایات، وضعداری اور جمہوری اقدار کو بالائے طاق رکھ کر اقلیت کی دلآزاری کرنا ہی اپنا شیوہ بنالیا ہے۔

یہ عجب ہے رسم دنیا کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

۲۰ر نومبر ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

علامہ اقبال سے ایک ملاقات سہ رہا ہے

علامہ اقبالؒ کی صد سالہ سالگرہ پوری دنیا میں منائی جا رہی ہے۔ ایک روز جب میری ان سے سہ رہا ہے ملاقات ہو گئی تو میں نے حالات حاضرہ پر ان سے کئی سوالات پوچھے انھوں نے جو جواب مرحمت فرمائے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان نے دوسری آزادی حاصل کی ہے اور پھر سے یہاں جمہوریت بحال ہوئی ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اقبال دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب :: تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین، اصلاح و رعایات و حقوق :: طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں :: یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو :: آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

میں تو کیا کانگریسی حکومت کی طرح جنتا پارٹی کے وعدے بھی فریب ہیں؟

اقبال ساحر الموطن نے تجھ کو دیا برگ حشیش :: اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

میں کیا یہ لوگ بھی یوں ہی عوام کو دھوکے دیتے رہیں گے اور وعدے پورے نہیں کریں گے؟

اقبال آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر :: اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

میں تو کیا اس الیکشن کے دوران جنتا پارٹی کے لئے عوام نے جو جوش و خروش دکھایا وہ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سب رائیگاں جائے گا؟

اقبال کٹ مرا نادان خیالی دیوتاؤں کیلئے :: سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

میں پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

اقبال یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے :: پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

میں اور موجودہ آزادیٔ اظہار؟

اقبال مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی :: کہ جو ظاہر میں آزادی ہے باطن میں گرفتاری

میں جنتا پارٹی پر آپ کا تبصرہ؟

اقبال منزل راہ رواں دور بھی دشوار بھی ہے :: کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

میں کیا واقعی؟

اقبال کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق :: نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش :: میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش :: خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

میں "مکمل انقلاب" کے جنم داتا لوک نائک شری جے پرکاش نرائن کے بارے میں آپ کا خیال؟

اقبال پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی :: تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

میں اور مولانا عبداللہ بخاری؟

اقبال قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے :: اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

میں اندرا گاندھی؟

اقبال تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں :: آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

میں ——— سنجے گاندھی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

اقبال ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں :: ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں ہمارے وزیر اعظم شری مرار جی بھائی پیشاب پینے کا بہت پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال گذر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

میں چودھری چرن سنگھ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے :: اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

میں مرار جی اور چرن سنگھ کے اردو مخالف بیان پر آپ کا تبصرہ۔

اقبال پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر :: مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

میں شری ہیم وتی نندن بہوگنا؟

اقبال قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر :: توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر

میں اور جنتا پارٹی کے مسخرے شری راج نرائن؟

اقبال گلزارِ ہست و بود نہ دیوانہ وار دیکھ :: ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

میں شری اٹل بہاری باجپائی۔

اقبال نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے :: پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

میں شیخ عبداللہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی :: اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

میں اور اردو پر کرسی کو ترجیح دینے والے غلام سرور؟

اقبال کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن :: خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

میں وہ تو آپ کے بہت بڑے مداح تھے لیکن خود ان کی حکومت نے آپ کا ٹکٹ نہ نکالنے کا فیصلہ کیا تو وہ خاموش تماشائی بنے رہے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اقبال اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

میں اتر پردیش وزارت سے استعفےٰ دینے والے نوجوان وزیر عارف محمد خاں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں :: نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

میں اور بہار کے نوجوان وزیر جابر حسین کے دلیرانہ اقدام پر؟

اقبال محبت مجھے ان جوانوں سے ہے :: ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

میں اور شاہ کمیشن کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اقبال یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

میں شاہ کمیشن کے سامنے ترکمان گیٹ کے مظلومین نے بہت دلدوز بیانات دیئے ہیں

اقبال پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری :: ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیوں کر ہوا
میرے لٹنے کا تماشہ دیکھنے کی چیز تھی :: کیا بتاؤں ان کو میرا سامنا کیوں کر ہوا

میں ترکمان گیٹ کے مظلومین کے بارے میں؟

اقبال اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

میں لکھنؤ کے شیعہ سنی فساد کے متعلق؟

اقبال منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک :: ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک :: کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں :: کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

میں بنارس کا خونیں فساد؟

اقبال اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے :: کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں جنتا پارٹی کے صدر شری چندر شیکھر جو پہلے بڑے انقلابی رہنما تھے اب فرقہ پرستوں کے ہاتھوں میں بالکل بے بس نظر آتے ہیں؟

اقبال اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا :: مجھے فکر جہاں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

میں جنتا پارٹی کا مستقبل؟

اقبال تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

میں آر۔ ایس۔ ایس چیف بالا صاحب دیورس کے بارے میں آپ کا خیال؟

اقبال تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں :: یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

میں آر۔ ایس۔ ایس کے ایک سنچالک بابا صاحب بھڑے نے مسلمانوں کے خلاف ایک بہت زہریلی تقریر کی ہے۔

اقبال تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دلآزاری کا :: امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

میں پھر بھی جماعت اسلامی کے مولوی آر ایس ایس سے پینگیں بڑھاتے رہتے ہیں

اقبال یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے :: گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

میں مسلمانوں کے موجودہ زوال کا سبب؟

اقبال آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی :: جب یہ جمعیت گئی ملت میں رسوا تو ہوا

میں کمیونسٹ پارٹی کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟

یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت :: پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

میں کانگریس کے موجودہ اختلافات کا انجام کیا ہوگا؟

اقبال میں جانتا ہوں جمعیت کا حشر کیا ہوگا :: مسائل نظری میں الجھ کر گیا ہے خطیب

میں پاکستان کے موجودہ حالات کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اقبال سکون آمیز طولِ داستان درد ہے ورنہ
زبان بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

میں جنرل ضیاء الحق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئین نے قوموں کو :: مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

میں اور ذوالفقار علی بھٹو؟

اقبال تمام عقل سے آسان گذر گیا اقبال مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

میں اور بے نظیر بھٹو؟

اقبال جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

میں اور مفتی محمود؟

اقبال خود مجھ کو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی :: اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

میں ان کی جماعت پاکستان نیشنل الائنس؟

اقبال غضب ہیں یہ مرشدان "خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

میں مصر کے صدر سادات کے حالیہ دورۂ اسرائیل کے متعلق آپ کا نظریہ؟

اقبال بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

میں لیکن انھوں نے فلسطین جا کر قبلۂ اول میں نماز بھی ادا کی تھی

اقبال سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے :: دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

میں اور اسرائیلی وزیر اعظم بیگن؟

اقبال تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار :: جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح :: دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

میں اور جمی کارٹر کے بارے میں بھی کچھ فرمائیے

اقبال مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں :: لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

میں اصلاح پسند بوہروں کی بھی آپ کو کچھ خبر ہوگی۔ ان کے متعلق کچھ کہنا پسند کریں گے ؟

اقبال بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی :: مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

میں اور کچھ میرے متعلق بھی فرما دیجئے۔

اقبال نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پھر "بالِ جبریل" "بانگِ درا" "ضربِ کلیم" کے سارے اوراق پھڑپھڑا کر اڑ گئے اور جیسے پیر و مرشد یہ فرماتے ہوئے چلے گئے۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شائد کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

حالاں کہ ایران کی یہ مشہور کہانی میں کئی بار لکھ چکا ہوں لیکن ۱۲ مارچ ۷۸ء کو "جے پرکاش نرائن امرت مہوتسو" کے جلسے میں جب خشت باری، روڑے بازی، کلوخ اندازی چپل بازی، جوتم پیزار اور بھگدڑ ہوئی تو پھر بے اختیار مجھے وہ کہانی یاد آگئی ——— ایران میں ایک شعلہ بیان مقرر تھا۔ اس نے بادشاہِ وقت کو ایک جلسے میں چیلنج کیا کہ کہئے تو میں ابھی ایسی تقریر کروں کہ لوگ جوش میں آکر آپ کی دھجیاں اڑا دیں ——— تو بادشاہ نے نہایت تحمل سے کہا یقیناً جیسا تم کہہ رہے ہو ایسا ہی ہوگا۔ لیکن جب انھیں ہوش آئے گا تو وہ تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اور حالات کا جبر و انتقام بڑا کرب ناک ہوتا ہے۔ جو دوسروں کیلئے جیسا بوتا ہے ویسا ہی خود کاٹتا بھی ہے۔ بس ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ شری جے پرکاش نرائن عوام کے ہیرو تھے۔ لوک نائک کہے جاتے تھے ان پر پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ آج ان پر چپل جوتے پھینکے جاتے ہیں۔

۷۴ء میں انہوں نے کانگریس حکومت کے خلاف تحریک چلائی ——— اور "مکمل انقلاب" کا نعرہ دیا۔ انھوں نے طلباء سے کہا کہ وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ دیں اور اسمبلی کا گھیراؤ کریں۔ وزیروں اور لیجسلیچروں سے زبردستی استعفے لکھوائیں۔ اس سے ایک انارکی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کانگریس حکومت پر عوام کا اعتماد نہیں رہا۔ اس لئے اسے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ آخر ش ایمرجنسی لگی اور پھر گذشتہ سال پارلیامنٹ کا الیکشن ہوا تو کانگریس بری طرح ہاری عوام کانگریس سے اس قدر بدظن ہو گئے تھے کہ مرے سڑے مردے بھی اس کے خلاف ووٹ ڈالنے چلے آئے۔ جنتا حکومت بنی تو لوگوں نے سمجھا کہ جے پی کا "مکمل انقلاب" آگیا۔ اس سرکار سے انھوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن ہوا اس کے برعکس چیزوں کی دن دونی رات چوگنی قیمتیں بڑھیں، انارکی، لاقانونیت اور بے ضابطگی بڑھی اور عوام کی مایوسی یہاں تک بڑھی کہ اب "لوک نائک مردہ باد" کے نعرے لگ رہے ہیں۔ انھیں برسر عام مغلظات سنائی جا رہی ہیں اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ ان کے "امرت مہوتسو" میں جو تم پیزار ہو گئی۔ کسی وزیر کو گاندھی میدان کے اندر داخل بھی نہیں ہونے دیا گیا۔ بہار کے وزیر صنعت سے تو مظاہرین زبردستی استعفے بھی لکھوا رہے تھے۔ بس ایک سال میں یہ حالت ہو گئی۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا　　بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اس جلسے میں ایک صاحب نے یہ کہا ہے کہ لوک نائک کی خدمات کو پیسے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ۹۰ لاکھ روپیوں کی تھیلی کس لئے؟ کیا ان کے "مکمل انقلاب" کی قیمت صرف ۹۰ لاکھ تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنا سب کچھ فروخت کر دیا؟ حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ یہ پتہ چلائے کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا؟ کیونکہ جے پی کے اس "امرت مہوتسو" کا خزانچی کوئی سرودے کا کارکن یا جنتا پارٹی کا ورکر یا سردیسی سنگھ کا رہنما نہیں تھا۔ بلکہ ایک مشہور صنعت کار اور بڑا سرمایہ دار تھا ——— جے پی ہمیشہ مجموعۂ اضداد رہے ہیں۔ ایک طرف وہ غریبوں کے حقوق کی باتیں کرتے رہے ہیں اور دوسری جانب سرمایہ داری کے مفادات کی نگہداشت کرتے رہے ہیں۔ آج جب کہ غریب اور امیر عوام

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے درمیان بڑی زبردست خلیج حائل ہے ان کے ۹۰ لاکھ روپیوں نے شعلوں پر پٹرول کا کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قدر و قیمت بہت گھٹالی ہے۔ انھوں نے اپنا قد بونا اور ٹھگنا کر لیا ہے اور انھوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے اسی پٹنہ میں اپنی دُرد شا دیکھ لی۔ جو اشخاص غریب عوام کے ساتھ مذاق کرتے ہیں، ان کی قسمت سے کھیل کرتے ہیں، وہ دیر تک اپنی شخصیت کا سحر طاری نہیں رکھ سکتے ان کا بھرم بہت جلدی کھل جاتا ہے وہ اپنی عبرتناک حالت ہی دیکھنے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔

یہ بات اب سب لوگ جان چکے ہیں کہ ۱۹۷۴ء کی تحریک جے پی نے نہیں چلائی تھی۔ جے پی کے ساتھ آدمی کہاں تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ تحریک آر۔ ایس۔ ایس نے چلائی تھی۔ اس کے پاس کام کرنیوالے تھے، شخصیت کی کمی تھی۔ جے پی کے پاس شخصیت تھی آدمی نہیں تھے۔ اور اس طرح دونوں کا ملاپ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جنتا پارٹی برسر اقتدار نہیں آئی بلکہ درپردہ ـــــ آر۔ ایس۔ ایس کو اقتدار حاصل ہوا اور آج جنتا پارٹی کے ترقی پسند اصحاب بری طرح پھندے میں پھنس گئے ہیں۔ ایسے شکنجے میں کہ باہر نکلنا مشکل ہے۔

جنتا پارٹی کی حکومت نے قلیل عرصہ میں عوام کو جس بُری طرح مایوس کیا ہے عوام بھی اس سے بری طرح مشتعل ہیں۔ اور اپنے اضطراب کے اظہار کیلئے اسی راستے پر چل پڑے ہیں جسے ۱۹۷۴ء میں جے پی نے دکھایا تھا۔ آج ہندوستان کی تقریباً تمام تعلیم گاہیں بند کر دی گئی ہیں کیونکہ سب جگہ ہنگامے ہو چکے ہیں۔ درس گاہوں کا اس طرح بار بار بند ہونا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے خود غرض سیاست داں انھیں اپنا آلۂ کار بنا کر بطور سیڑھی استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ حکمراں کل تک یہی کچھ کر رہے تھے حالانکہ آج اسے بُرا کہہ رہے ہیں۔ تحریک کے دوران وہ کہتے تھے کہ کانگریس حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ لیکن آج ان سے عوام زبردستی استعفے لکھوا رہے ہیں۔ سنگ باری کرتے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں۔ ان کے خلاف جلوس نکالتے ہیں۔ تو کیا یہ سب مقبولیت کی علامتیں ہیں؟ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موجودہ حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے اور اسے اب مزید حکومت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے عوام کی حمایت کھو دی ہے۔ لیکن سیاست میں ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، اس لئے یقینی ہے کہ جنتا حکومت آخر دم تک مستعفی نہیں ہوگی خواہ اس سے آخری آدمی کی بھی حمایت چھن جائے۔

جے پی امرت مہوتسو میں جو کچھ ہوا وہ اس بات کا مظہر تھا کہ بہار میں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں۔ مرکزی وزیر دفاع، بہار کے وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزراء تو جلسہ گاہ میں داخل تک نہیں ہو سکے سب کو گیٹ سے یا راستے سے واپس جانا پڑا ——— لیکن شائد حکومت کو اب بھی یہی غلط فہمی ہے کہ اسے عوام کی حمایت حاصل ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے وزیر اعلیٰ بار بار یہ کہتے ہیں، سب ٹھیک ہے اور امن و امان ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے ——— مگر اسے کیا کہا جائے کہ شتر مرغ ریت میں سر چھپا کر ہی خود کو محفوظ سمجھنے کا عادی ہے۔

۱۹ مارچ ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے راہزن سے غرض نہیں تری رہبری کا سوال ہے

کرناٹک اور آندھرا میں شاندار کامیابی کے بعد شری متی اندرا گاندھی کے قدم ان صوبوں میں بھی جمتے جا رہے ہیں جہاں جہاں جنتا پارٹی کی حکومت ہے۔ ابھی حال میں کرنال سے جو پارلیامانی الیکشن ہوا اس میں بظاہر جنتا پارٹی کی جیت ہوئی ہے لیکن بہ نظر غائر جائزہ لیجئے اور باریکی میں جائیے تو پتہ چلے گا کہ یہ جیت کتنی شرمناک ہے۔ محض ایک سال قبل جنتا پارٹی نے یہ سیٹ دو لاکھ باسٹھ ہزار ووٹوں سے جیتی تھی لیکن ایک سال میں ہی پارٹی نے عوام کا ایسا اعتماد کھو دیا کہ جنتا کا امیدوار بمشکل اٹھارہ ہزار ووٹوں سے جیت سکا۔ کانگریس آئی کی پوزیشن دوسری رہی اور کانگریس کے امیدوار شری ششی بھوشن تو محض دو ہزار ووٹ لا سکے اور ان کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

اب اندرا گاندھی جہاں جہاں جا رہی ہیں وہاں ان کا شاندار استقبال ہوتا ہے۔ جوق در جوق لوگ ان کی تقریر سننے آتے ہیں۔ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے محض ایک سال کے اندر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا ہے۔ عوام پھر ان پر اعتماد کرنے لگے ہیں انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں۔

یہ حالات جنتا پارٹی اور اس کے رہنماؤں کیلئے بہت ہی تشویشناک ہیں آخر ایک سال میں ہی کیا انقلاب آیا کہ مکمل انقلاب کا سحر کافور ہو گیا اس کی وجہ صرف اور صرف

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ایک ہے کہ جنتا پارٹی کے ناخداؤں نے ایک سال کے دوران باتیں بنانے، تقریریں کرنے الزام تراشی کرنے اور بیان بازی کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔

سیلاب آئے یا سوکھا پڑے، زلزلہ آئے یا آندھی طوفان سب کی ذمہ داری انہوں نے اندرا گاندھی کے سر تھونک دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ اندرا گاندھی حکومت میں رہیں یا حکومت سے باہر سب کچھ وہی کرنے پر قادر ہیں تو انھوں نے مجبور ہو کر پھر انھیں کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

جنتا حکومت کے ایک سالہ دور میں کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جان و مال کا نقصان ہوا اور کتنوں کی عزت لٹی لیکن حکومت نے کیا کیا سوائے یہ کہنے کہ سب کچھ اندرا گاندھی نے کروایا۔

ہمارے سوشلسٹ جارج فرنانڈیس صاحب جب سے وزیر ہو گئے ہیں انہوں نے سوشلزم کا جامہ بالکل اتار پھینکا ہے۔ اب ان میں اور کانگریسی وزیر میں کوئی فرق نہیں رہا۔ مگر وہ بار بار یہی کہا کرتے ہیں کہ اندرا گاندھی کو اب کبھی واپس نہ آنے دیں ورنہ پھر سے ڈکٹیٹر شپ آجائے گی مگر وہی سوال ہے کہ آپ حضرات تو عوام کو اس کیلئے مجبور کر رہے ہیں۔ مسلسل ایک سال سے عوام کو کچوکے لگا رہے ہیں۔ ملک کے بدتر حالات دیکھے نہیں جاتے ہیں۔ قانون نام کی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ہر جگہ فراغ ہے کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ ہر شخص خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے۔ حکومت بالکل بے بس ہے بس خاموش تماشائی ہے، غنڈوں، لفنگوں، لچوں کو چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں تو ان حالات میں آدمی کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ کتنا برداشت کر سکتا ہے۔ آخر برداشت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے عوام نے بڑی امنگوں، بڑی آرزوؤں اور بڑے حوصلے سے آپ کو حکومت بخشی لیکن آپ اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو نہیں پا سکے۔ ملک

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں قانون کی حکومت رائج نہیں کر سکے۔ غریب آج بھی سب سے زیادہ پسے اور دبے ہوئے ہیں۔ دولت مند زیادہ دولت مند ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر آپ کے پاس صرف ایک تاویل ہے۔ سب کچھ اندرا گاندھی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ حیلے بہانے عوام میں سننے کی اب سکت باقی نہیں ہے۔

نہ ادھر اُدھر کی تو بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا؟ مجھے راہزن سے غرض نہیں تری رہبری کا سوال ہے

اب اندرا گاندھی حکمراں نہیں ہیں کہ وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اب جواب دہی موجودہ حکمرانوں پر ہے۔ ان کی رہبری کو چیلنج ہے۔

کل کی ہی بات ہے کہ آج کے حکمراں جب اپوزیشن میں تھے تو یہ مطالبہ کرتے تھے کہ حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے اسے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ عوامی نمائندوں سے استعفے لکھواتے تھے۔ لیکن اب اس مسئلے پر یہ لیڈران قوم بالکل خاموش ہیں اب انھیں عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے تو وہ استعفے دیکر پھر سے عوام کی حمایت کیوں حاصل نہیں کرتے آج عوام میں حد درجہ بے اطمینانی ہے وہ اپنے ناکارہ منتخب نمائندوں کو واپس بلانا چاہتے ہیں لیکن یہ حضرات بھی کرسیوں سے چپک کر رہ گئے ہیں جو یہ کہتے تھے کہ عوامی نمائندوں کو واپس بلانے کا قانون بننا چاہئے مگر اب ہونٹوں پر اس طرح تالے پڑ گئے ہیں کہ آواز بھی نہیں نکلتی خوب ہے یہ دوغلا پن یہ دوغلی پالیسی۔ ان لیڈروں نے اب تک صرف عوام کو بیوقوف بنایا ہے۔ اور ملک کا بیڑا غرق کیا ہے۔ مگر کب تک؟ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی؟ یہ لوگ کب تک عوام سے روگردانی کرتے رہیں گے؟ کب تک انھیں دھوکہ دیتے رہیں گے؟ بالآخر انھیں عوام کے سامنے جانا پڑے گا اور ذلت ناک شکست ان وعدہ خلافی کرنے والوں کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔

ایک سال قبل محض جوش ہی جوش تھا۔ ان حالات میں کسی کو سوچنے غور و فکر کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اب ہوش آیا تو محاسبہ بھی کیا جا رہا ہے اور اپنے عمل پر پچھتاوا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھی۔ ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے گذر جائے۔ اب بھی وقت ہے کہ جنتا پارٹی ہوش کے ناخن لے اب بھی وہ کمیشن بازی کرنے اور کرتب بازی کرنے کے بجائے عوامی مفاد کے کچھ کام کرے۔ عوام کا اعتماد حاصل کرے۔ کمیشن مسائل کا حل نہیں ہیں۔ ان پر عوام کی گاڑھی کمائی کا کروڑوں روپیہ ضائع ہو رہا ہے جن سے عوامی بھلائی کے سینکڑوں کام کئے جا سکتے ہیں۔

حالانکہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اب بر خود غلط اشخاص کو ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ جب کرسیوں کے نیچے آگ سلگ رہی ہو، جب کرسیاں بارود کے ڈھیر کے اوپر رکھی ہوں اور ایسے میں خواب غفلت کے مزے لوٹے جائیں اور فرعونی طاقت کا مظاہرہ کیا جائے تو ایسے نادان کو کون بچا سکتا ہے؟

روم کو جلتے ہوئے دیکھ کر نیرو کے بانسری بجانے کی بات محض لوگوں نے کتابوں میں پڑھی تھی لیکن آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

۱۶ر اپریل ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

روس کے جلاوطن ادیب الکزینڈر سولنیٹسن نے کہا تھا کہ ایک سچا ادیب اپنے ملک میں متوازی حکومت کی حیثیت رکھتا ہے اور کوئی حکومت اندرون ملک متوازی حکومت برداشت نہیں کر سکتی ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں سچے فنکار کی بے عزتی اور بے حرمتی ہوتی ہے۔

فنکار، ادیب اور صحافی کو کوئی حکومت راس نہیں آتی۔ بادشاہت ہو یا شہنشاہیت آمریت ہو یا جمہوریت، کوئی بھی حکمراں اس طبقے کو پسند نہیں کرتا۔ بادشاہ، راجے مہاراجے نواب اور سلاطین ہمیشہ ان شعراء کے معترف رہے جو اٹھتے بیٹھتے ان کے قصیدے پڑھتے تھے ان کی بلائیں لیتے تھے اور ان کی ہر ادا پر نثار ہوتے تھے۔ لیکن کسی سے ذرا سی گستاخی سرزد ہوئی تو تیوریوں پر بل آ گئے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اس دور میں سچے فنکار نہیں تھے تھے اور بہت تھے لیکن غیور اور سرکش ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ خانہ بربادی پریشان و بدحال رہے

آج بھی کسی ملک میں بادشاہت ہے کہیں آمریت اور کہیں جمہوریت لیکن ان میں سے کوئی طرز حکومت خوددار اور سچے فنکار کو راس نہیں آ رہا ہے۔ کمیونزم تو قلم اور آزادیٔ اظہار کا سخت ترین دشمن ہے۔ اسی لئے سوشلسٹ ملک روس کی فضا بھی اس کے سخت خلاف ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگ اٹھتے بیٹھتے روس کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں اور وہاں کے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

حکمرانوں کی ادب دوستی کے گن گاتے رہتے ہیں لیکن اب دنیا بھر کے عوام کو پتہ چل چکا ہے کہ روس میں جتنے ادیب موجود ہیں ان سے کہیں زیادہ سائبیریا کے مشقت کیمپوں میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ وہی غیور و سرکش ادیب و صحافی ہیں جو حکومت کے جبر و ظلم پر مہر بلب رہنے کو تیار نہیں۔ اور جو حکومت کے ہمنوا ہیں وہ حسب روایت داد عیش دے رہے ہیں۔

اسلام آزادیٔ اظہار کی حمایت کرتا ہے اسی لئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ سچی بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ اور اگر تمہیں سچائی کا علم ہو تو اس کو جان بوجھ کر اپنے تک نہ روکے رکھو" لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اسلامی ملکوں کی فضا بھی آزادیٔ اظہار کی مخالف ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں سرکردہ ادیبوں اور صحافیوں کو تو کوڑوں تک سے نوازا گیا ہے۔

جمہوریت کو سب سے بہتر طرز حکومت کہا گیا ہے۔ ہم خود بھی ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمہوریت بھی ادیب، شاعر و صحافی کو راس نہیں آ رہی ہے۔ اردو صحافت کا مزاج تو شروع سے ہی باغیانہ رہا ہے اسی لئے اردو کے اولین صحافی مولانا باقر کو گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ انگریزوں کے بعد کانگریسیوں کی حکومت آئی اور ایمرجنسی آتے ہی سب سے پہلے اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی جنتا حکومت نے پریس کو آزاد کرنے کی یقین دہانی کی تھی اور اس پر عمل بھی کیا لیکن گذشتہ دنوں جو کچھ واقعات ہوئے ان سے توقعات دھندلی ہو گئیں۔ تامل ناڈو میں جنتا یا کانگریس کی حکومت نہیں ہے وہاں آل انڈیا انا ڈی ایم کے حکمراں ہے۔ گذشتہ دنوں جے پرکاش نرائن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منعقدہ ایک جلسے میں وزیر اعلیٰ شری رامچندرن نے جے پی و مہاتما گاندھی کے خلاف بول کر خوب جی کی بھڑاس نکالی۔ ایسا بولنے کا ان کو حق تھا کیوں کہ اختلاف رائے کا حق سب کو حاصل

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہے لیکن بعد میں انھوں نے اخباری نمائندوں کو بلا کر تنبیہہ کی کہ کوئی بھی اخبار ان باتوں کو شائع نہ کرے۔ اور یہ خبر دہلی کے اخبارات میں تو شائع ہوئی پر تمام مقامی اخباروں سے غائب تھی۔

دوسرا واقعہ پنجاب میں ہوا جہاں اکالی وجنتا کی ملی جلی حکومت ہے۔ وہاں کے ایک اکالی ایم ایل اے نے اخبار نویسوں کو تنبیہہ کیا کہ کوئی بھی ہماری حکومت کے خلاف لکھے گا تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔

تیسرا واقعہ اتر پردیش کا جہاں کے ایک نائب وزیر نے عام جلسے میں کہا کہ اخبار نویس لالچی وچاپلوس ہوتے ہیں۔

چوتھا واقعہ بہار کا ہے جہاں ایک وزیر نے دو مقامی اخبار نویسوں کو خوب گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ وہ ان کے دفتر میں غنڈے بھیجدیں گے۔ یہ خبر بھی دہلی کے اخبار میں شائع ہوئی۔ اور اخباری تنظیموں نے ان باتوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔

یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ آج بھی اخباروں کی آزادی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے۔

ایک جانب اخبار نویسوں کی یہ حالت ہے اور دوسری جانب ادیب وشاعر اور بھی بدتر حالت سے گذر رہے ہیں۔ پہلے ادیب وشاعر دربار سے منسلک ہوتے تھے آج وزیروں کی قصیدہ خوانی کر کے ان کے دربار سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ جو اپنی غیرت و حمیت کو قتل کر کے ایسا کر پاتے ہیں وہ کسی نہ کسی طور پر گذر اوقات کر لیتے ہیں۔ لیکن جینوئین اور اصل شاعر وادیب آج بھی کس مپرسی کے حالات سے گذر رہے ہیں۔ حکومت کے کچھ ادارے ہیں جن کا مقصد ادیبوں وشاعروں کی ہمت افزائی وعزت افزائی کرنا ہے لیکن ان سے درباری شعراء وادبا ہی مستفیض ہوتے ہیں۔ جو واقعی مستحق ہیں انھیں کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ حالت کم وبیش ہر زبان میں ہے ہر ملک میں ہے لیکن ہندوستان اور خاص طور پر اردو میں کچھ زیادہ ہے۔ حکومت نے اردو ترقی بورڈ، اردو اکادمیاں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انجمن ترقی اردو کی گرانٹ کے نام پر کچھ ہڈیاں اردو والوں کے درمیان ڈال رہی ہیں اور ان ہڈیوں کے لئے بہت سے کتے آپس ہی میں لڑ پڑے ہیں آج حالت یہ ہے کہ ان ادبی اداروں پر بے ادب سیاستدانوں کا قبضہ ہے اور وہ اسے اپنی میراث سمجھتے ہیں ان سے بھی تخلیق کاروں کو کچھ ملنے ملانے والا نہیں ہے۔ سارے پیسے سیاستدانوں کی جیب میں چلے جائیں گے اور وہ انھیں بغیر ڈکار لئے ہضم کر جائیں گے۔ ہاں جو ادیب سیاستداں بن گئے ہیں جنھوں نے اپنی چمڑی موٹی کر لی ہے ان کے مزے ہی مزے ہیں۔ وارے نیارے ہیں۔ مگر سچے فنکار کو نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا نہ پہننے کا۔ نہ گھر ہے نہ در اور نہ اس کی امید۔ شاید کوئی دور ایسا نہیں آئے گا جب جینوئین فنکار کی قدر ہو۔

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

۳۰ر جولائی ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق

پھر ماہِ صیام آگیا ہے۔ باری تعالیٰ کی رحمتوں کا مہینہ ——— سال کے گیارہ مہینے گزار کر یہ برکتوں کا مہینہ آتا ہے اور ہمیں اس کا موقع دیتا ہے کہ اپنا محاسبہ کریں۔ اپنے گناہوں سے توبہ استغفار کریں اور خدائے بزرگ و برتر سے اپنی نجات کیلئے دعا مانگیں۔

کیا ہمیں اس بات پر غور کرنے کی فرصت ملتی ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکیں؟ افسوس ہے کہ اس تیز رفتار زندگی میں ہم بھی اس مشین کا محض ایک پرزہ بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہمیں اس دنیا میں کسی اور مقصد سے بھیجا گیا تھا مگر ہم اس قدر گم کردہ راہ ہو گئے کہ ہم اپنی منزل بھی بھول گئے اور دنیاوی اشیاء کو ہی ہم نے مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ہم نے اسلاف کی زندگی سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا کہ وہ اس دنیا میں آئے اور کس طرح اسلام کو سربلند کیا مگر ہم مسلمان ہو کر بھی آج کتنے ذلیل و خوار ہیں۔

زندگی عمل سے بنتی ہے۔ ہم نے خود کو غلط راستوں پر ڈال دیا ہے۔ دنیا کے لہو و لعب کو ہی اپنا مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے اور مادیت کے اس دور میں ہر شخص آگے نکل جانے کیلئے بے تاب ہے مگر کسی کو ہوش نہیں ہے تو بس اس دنیا کا جہاں اسے ہمیشہ ہمیش رہنا ہے۔ یہ دنیاوی کر و فر یہ رنگ و نکہت اور شوکت و عظمت ساتھ جانے والی نہیں ہے۔ دنیا کی ہر شئے فانی ہے۔ ایک مسلمان کو یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہئے اور اگر یہ بات ذہن میں رہے تو کوئی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

وجہ نہیں کہ قدم بہک جائیں۔ مگر افسوس کہ بات یہی ہے کہ یہ بات ہی ہمارے ذہن سے نکل جاتی ہے۔

ہم سیاسی محاذ پر لڑتے ہیں سماجی محاذ اور ثقافتی محاذ پر صف آرائی کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم نے کبھی یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ ہماری پسماندگی کی وجہ کچھ اور بھی ہے یعنی مذہب کے راستے سے بھٹک جانا اسی میں ہماری ساری تنزلی اور ذلت و خواری کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ ہمیں زمین پر خدا کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا تھا ہمیں اتنا بڑا مرتبہ عطا کیا گیا مگر ہم نے خود کو قعر ذلت میں گرا دیا۔ ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا جس نے خود اپنی منزل کھو دی۔

اسلام صرف ایک مذہب کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے نظام زندگی ہے اور طرز معاشرت ہے۔ اس سے الگ ہونے کا مطلب خود کو کم تر و بے وزن ثابت کرنا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آج ہم اپنوں اور بیگانوں سب کی نظر میں کم وقعت اور بے قیمت ہو گئے ہیں۔ آج ہماری حقیقت کیا ہے؟ اسلام نے ہمیں مساوات کا درس دیا تھا مگر ہم خود کو خانوں میں تقسیم کر لیا۔ کہیں ذات پات کے خانوں میں اور کہیں غربت اور امارت کے خانوں میں۔ اسلام نے ہمیں ایثار و قربانی کا درس دیا مگر ہم میں یہ جذبہ مفقود ہوتا گیا

یعنی ہم بتدریج اسلام سے دور ہوتے گئے کہنے کو تو ہم اب بھی مسلمان ہیں لیکن ہم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھیں کہ کیا واقعی ایسا ہے۔ خدا کرے ایسا ہو مگر ہم گہرائی میں ڈوب کر سوچیں تو ہمیں یہی اندازہ ہوگا کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم محض رسوم کے قیدی ہیں۔ خالی خولی رسمیں رہ گئی ہیں۔ اسلام ہمارے جذبات و احساسات میں جاری و ساری نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا۔

آج کیفیت یہ ہے کہ ہم صف شکستہ، دل شکستہ، حرص و ہوس کے پتلے، خوابوں کی دنیا میں رہنے والے انسان بن کر رہ گئے ہیں۔ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان ضرور ہمارے پاس ہے لیکن طوفان کے دل دہلانے والے عزائم نہیں ہیں۔ نہ دلوں میں ولولہ ہے اور نہ سینوں میں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اضطراب۔ نہ نغموں میں لذت ہے اور نہ نوحوں میں اثر۔ ہاتھ لذت کار سے نا آشنا ہیں اور پیر کوہ پیمائی کے جذبے سے محروم۔ نہ رزم میں پاک دلی ہے اور نہ بزم میں پاکبازی۔ نہ فیصلوں میں پختگی ہے اور نہ کردار میں بلندی۔ کرگسوں میں پلنے کے باعث آداب شاہ بازی سے بھی بے خبر ہیں ہمارے سینے جہاں جذبات کے سمندر ابلتے تھے وہ اب راکھ کا ڈھیر ہیں۔ وہاں گرد اڑتی ہے۔ ذہنوں میں صرف ذاتی مفادات کے تانے بانے ہیں۔ ہر لمحہ ذہن سازشوں کے جال بچھانے میں الجھا رہتا ہے۔ افکار و نظریات میں سطحیت ہے بے حسی ہے، مکمل بے حسی، دل شکستگی اور شکست خوردگی کا احساس ہے۔ نہ دل میں قربانی کی تڑپ ہے اور ذہن میں ایثار کی لگن۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ ضرور ہے لیکن کردار و عمل میں ہم صفر ہیں۔ اور اسلام صرف اور صرف عمل کا نام ہے اسلام میں نام نہاد ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ہے۔ ہم اس لئے ذلیل و خوار ہیں کہ دوسروں کو گرا کر اوپر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پوری قوم بے سمتی کا شکار ہو رہی ہے اس کے لئے کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں ہے ہم خود ذمہ دار ہیں کیوں کہ ہمارے پاس ایک مکمل ضابطۂ حیات موجود ہے اس کے باوجود اگر ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں تو یہ ہماری اپنی کوتاہی اور بے خبری کی دلیل ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے ؛ مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق ؛ کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

لیکن ابھی بھی وقت گیا نہیں ہے۔ ابھی بھی ہماری کھوئی ہوئی عظمت، وقعت واپس مل سکتی ہے اور صبح کا بھولا ہوا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا کہا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم اپنے اندر ایمان کی وہی قوت آج بھی پیدا کر لیں تو حالات بدل سکتے ہیں۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا ؛ آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہمارے لئے کوئی دوسرا کرنے نہیں آئے گا۔ اپنی شیرازہ بندی ہمیں خود کرنی ہے اپنے مسائل کا حل ہمیں خود ہی تلاش کرنا ہے اور یقیناً اس سے بہتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم راہ راست پر آجائیں ورنہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

رمضان مسلمانوں کو ایک ماہ تک ٹریننگ دینے کے لئے آتا ہے ہم اس ایک ماہ میں جو نیک کام کرتے ہیں آئندہ بھی اسی پر گامزن رہنے کا درس دینے کے لئے آتا ہے رمضان میں جو سخاوت و رقیق القلبی ہم اختیار کرتے ہیں اسے قائم و دائم رہنے کا سبق دیتا ہے۔ کاش کہ یہ سبق ہم یاد رکھ سکیں۔ اسلام میں مساوات ہے۔ یہ ہمیں ایثار و قربانی کا درس دیتا ہے اس لئے اسلام میں یہودیت اور مارواڑی پن کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو اس چند روزہ زندگی کو ہی دائمی زندگی سمجھ بیٹھتے ہیں اور جنہوں نے اس دنیاوی عیش و عشرت کو ہی کائنات سمجھ لیا ہے وہ بہت بڑی بھول کر رہے ہیں اور اگر وہ اب بھی نہ سنبھلے تو پھر انھیں پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔

۱۶ر اگست ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

برقِ رقصاں ہے گلستاں کے قریب

لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے گذشتہ سال دوسری آزادی حاصل کی لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آزادی خطرے میں ہے۔

دوسری آزادی بہر حال فریب تھی اور عوام کو جو خوش فہمیاں تھیں وہ چند ماہ بعد ہی ختم ہو گئی تھیں۔ اب تو عوام بے سمتی کا بھی شکار ہیں اور ان کی ساری آرزوئیں خاک میں مل چکی ہیں۔

دوسری آزادی ایک مفروضہ تھی اس لئے میں اس کے بارے میں نہ کچھ جانتا ہوں اور نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس ملک نے ۱۹۴۷ء میں غلامی کا طوق اتار کر آزادی حاصل کی تھی اور اس کے لئے برصغیر کے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے قربانیاں دی تھیں۔ اور آج یہ آزادی خطرے میں ہے ——

گذشتہ سال کے پارلیامانی الیکشن میں جنتا پارٹی نے اکثریت حاصل کی جو دراصل کوئی پارٹی نہیں بلکہ چھ یا سات پارٹیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اضداد بھی ہے کیونکہ اس میں جو افراد شامل ہیں ان میں قطبین کا فرق ہے۔ اس لئے ان کے آپس میں ضم ہونے کا سوال ہی نہیں۔ یہ بس ایک وقتی گٹھ بندھن ہے جو کہ وقتی ضرورت کے لئے یا فردِ واحد کی مخالفت کے لئے وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ سال کا عرصہ گذر جانے پر بھی بجائے پارٹیوں کا انضمام ہونے کے اختلافات کی خلیج بڑھی ہے اور آئے دن جوتیوں میں دال بٹتی رہتی ہے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اس کا سب سے بُرا اثر عوامی زندگی پر پڑتا ہے۔ حکومت پر پڑتا ہے حکومت کی ساری مشنری پر پڑتا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ حکومت کی مشنری اور ایڈمنسٹریشن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ آج عوامی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔ سکون ختم ہو گیا ہے۔ بدامنی اور طوائف الملوکی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت اور قانون نام کی چیز ہے ہی نہیں۔

عوام کو اس بات سے زیادہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ حکومت کس پارٹی کی ہے انہیں اس بات سے مطلب ہوتا ہے کہ حکومت ان کی جان و مال اور حقوق کی حفاظت کر رہی ہے یا نہیں انھیں آگے بڑھنے کے مواقع دے رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس سلسلہ میں خلوصِ دل سے ڈیڑھ سالہ دور حکومت کا جائزہ لیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر تیاگ تپسیا اور سادگی کی قسم کھانے والوں نے اپنی عیاشیوں پر حکومت کا خزانہ خالی کر دیا ہے۔ اگر یہی مہاتما گاندھی کی سادگی ہے تو پھر عیاشی کسے کہا جائے گا۔ یہ سراسر عوامی دولت کی بربادی ہے۔ کس وزیر کا رہن سہن سادہ ہے۔ کس کی زندگی صاف ستھری ہے۔ وزیر علی الاعلان غنڈے پالنے پر فخر کرتے ہیں۔

یہ ملک مختلف مذاہب، زبانوں، اور تہذیبوں کا سنگم ہے۔ لیکن آج ہر شخص اپنی جگہ پر خوفزدہ ہے۔ افراتفری کا عالم ہے ہریجنوں اور کمزور طبقوں پر آئے دن مظالم ہو رہے ہیں۔ آئے دن ہولناک خبریں آتی ہیں۔ اقلیتیں اپنی جگہ پر خوفزدہ ہیں۔ ان کی زبان۔ ان کی ثقافت، ان کی تہذیب، ان کی میراث اور ان کی معیشت پر منظم حملے ہو رہے ہیں۔ بنارس، لکھنؤ، کانپور، جونپور سنبھل، قنوج وغیرہ اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ فساد کون کرواتا ہے؟ آج اقلیتیں خود کو بے طرح غیر محفوظ تصور کر رہی ہیں۔

اس ملک کی اقلیتوں کی ایک اہم زبان "اردو" پر بھی سرکاری سطح سے حملے ہو رہے ہیں۔ ذمہ دار وزراء تک نے اردو کے خلاف دلآزار اور لغو بیانات دیئے ہیں اور ساری

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مشنری اسی طور پر کام کر رہی ہے جب حکومت ہی کی نیت درست نہ ہو تو پھر ماتحت کیسے صاف ذہنیت کے ساتھ کام کر سکتے ہیں؟

اس ملک کا حسن، اس کی رنگا رنگی، اس کی آرائش و زیبائش، اس کی انفرادیت مختلف مذاہب، مختلف فرقوں، مختلف زبانوں اور رسم و رواج سے ہے۔ کئی ریاستیں ہیں سب کی اپنی اپنی تہذیب ہے۔ الگ الگ زبان ہے، الگ رسم و رواج ہیں۔ لیکن سب ہندوستانی ہیں کوئی چیز ہماری یک جہتی میں حائل نہیں ہوتی مگر اب اس یک جہتی کے سامنے بھی بڑا بھاری چیلنج ہے۔ جنوبی ہند کی ریاستیں یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے وہاں زبان کے مسئلے پھر سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہاں ہندی کی مخالفت شروع ہو چکی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ہندی ان پر زبردستی لادی جا رہی ہے اور ان کی زبان کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اس میں حقیقت کتنی ہے اور سیاست کتنی اس سے ہمیں بحث نہیں لیکن یہ خبر ہمارے ملک کی سالمیت کے لئے بہت بڑا چیلنج بن سکتی ہے اس مسئلے کو آج نہ سلجھایا گیا تو کل اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اس کا ہماری یک جہتی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آج عوامی زندگی میں جو شورش اور افراتفری ہے اس کا اثر صنعتوں پر بھی پڑ سکتا ہے صنعتوں اور کل کارخانوں کے اس سے اثر انداز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پروڈکشن متاثر ہو رہا ہے، پیداوار کم ہو رہی ہے آئے دن ہڑتالیں اور توڑ پھوڑ کے واقعات ہو رہے ہیں جس کا اثر براہ راست پیداوار پر پڑتا ہے۔ کارخانے کے چکے جام ہونے کا مطلب ہے ملک کی ترقی میں رکاوٹ۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں کون سا ایسا کارخانہ ہے، کون سا ایسا دفتر ہے جہاں ہڑتال نہیں ہوئی ہے آئے دن ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور پیداوار کی رفتار سست ہو گئی ہے۔ ملک کی معیشت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

ہمیں سمتوں کا پتہ نہیں ہے ہمیں اپنے راستوں اور منزل کا بھی پتہ نہیں ہے حکومت

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کس طرف جا رہی ہے ؟ ہم کس طرف جا رہے ہیں ؟ آزادی کا مطلب بہر حال بے لگام ہونا نہیں ہے۔ جمہوریت نے ہمیں آزادی دی ہے۔ تو اس کے ساتھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ ہم اپنے فرائض سے قطعی طور پر غافل ہو گئے ہیں محض ہم غافل نہیں ہوئے ہیں ہمارے رہنما حکومت پا کر اطلس و کم خواب کے بستروں پر داد عیش دے رہے ہیں جیسے انہیں کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ انھیں کسی بات سے کچھ مطلب ہی نہیں ہے۔ انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہی نہیں ہے۔

ہماری آزادی ہر طرف سے خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ بغیر روٹی کے آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی، چند افراد کی آسائش سے قوم کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ افسوس کی بات ہے کہ جو افراد فرش سے اٹھ کر گئے تھے آج ان کا دماغ عرش پر ہے۔ وہ مسائل سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہر شخص بغیر سمت کا تعین کئے بھاگا جا رہا ہے یک جہتی کا فقدان ہے۔ خدا جانے اس ملک کا کیا ہوگا ——؟

یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پوری قوم کے سامنے ہے لیکن ہمارے رہنما شاید ابھی اس پر کچھ سوچنے کو تیار نہیں ہیں۔

حصۂ کیف بہاراں کی پڑی ہے سب کو
اور بجلی ہے کہ رقصاں ہے گلستاں کے قریب

آزادی نمبر ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اُف یہ مسلمان وزیر

مسلمان وزیر ہندوستانی مسلمانوں کے دل کا ناسور بن چکے ہیں۔

اب ان سے سڑاند آنے لگی ہے۔

یہ عیاشی مسلمانوں کے لئے بہت گراں ثابت ہو رہی ہے اور اگر کل حکومت سے یہ مطالبہ کیا جانے لگے کہ مسلمانوں کو وزیر نہ بنایا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ مسلم کوٹے سے وزیر بن کر مسلمانوں کی نمائندگی کا دم بھرنے والوں نے خود کو کتنا بے ضمیر، مسلم دشمن، اسلام کش اور ننگِ قوم ثابت کر دیا ہے کہ اب ان پر سے مسلمانوں کا اعتماد قطعی طور پر اٹھ چکا ہے۔

ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ مسلمان وزیر نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے یا برسرِ عام اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ہمیں اس بات سے بھی بحث نہیں کہ وزارت حاصل کر کے یہ عیاشیاں کر کے نہ صرف اپنی بلکہ پوری قوم کی صورت مسخ کر رہے ہیں۔

ہمیں اس بات سے بھی مطلب نہیں کہ مسلم وزیروں نے ضمیر فروشی، کنبہ پروری، اقربا پروری اور بدکرداری میں بہت شہرت حاصل کر لی ہے۔

لیکن ہمیں اس بات سے بحث ہے کہ جسے مسلمانوں کے کوٹے سے مسلمانوں کی نمائندگی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کے لئے وزیر بنایا جاتا ہے وہ یا تو مسلمانوں کی نمائندگی کرنا نہیں چاہتا یا پھر اس کا اہل نہیں ہوتا۔ ایک طرف جہاں اسے مسلمانوں کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور مسلمان اس سے توقع کرتے ہیں کہ وہ قوم کا کام کرے گا مگر اس کا کردار اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

مسلم وزیر قوم کے مفادات کو کیوں نظر انداز کرتے ہیں؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ ہر شخص نے اس پر بارہا سوچا ہوگا۔ لیکن شاید اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔؟

میں نے جہاں تک اس سوال پر غور و خوض کیا ہے اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مسلمان وزیر اخلاقی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور ان کا سارا وقت محض لیڈر (وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم) کی خوشنودی حاصل کرنے میں گذر جاتا ہے ان کی خوشنودی حاصل کر کے وہ اپنی کرسی بچاتے رہتے ہیں اور اس کرسی بچانے میں ہی ان کا سارا وقت گذرتا ہے اسی وجہ سے قومی یا ملکی کام کرنے کی انھیں فرصت ہی نہیں۔ وزیر کی شکل میں انھیں جو آسائشیں ملتی ہیں وہ انھیں قوم کے تمام مسائل سے بے بہرہ کر دیتی ہیں پھر کوئی معتبر یا غیر معتبر آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ ایسے اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں کہ خود کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں اور انھیں سمجھانا بے سود ہے۔

لیڈر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے خواہ اس میں قوم و ملت کا کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ ہو۔ انھیں صرف اور صرف مفاد کی فکر ہوتی ہے۔ کچھ روز قبل ایک مسلم وزیر نے اپنی حکومت کو خلافت اسلامیہ سے تعبیر کیا۔ اب اس بے ضمیر مسلمان کو کون بتائے کہ اسلامی خلفائے راشدین قوم کا پیسہ اس بیدردی سے اپنی ذات پر عیاشی کیلئے صرف نہیں کیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں ایسا کر کے اس نے حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور دوسرے خلفائے راشدین کا مذاق اڑایا تھا یا پھر کوئی بات اس کے ذہن میں تھی۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ اس طرح کی کتنی مثالیں مل جائیں گے کہ مسلم وزیر مسلمانوں کے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بارے میں دلآزار بیانات دیتے رہتے ہیں اور اس طرح بالواسطہ طور پر حکومت کو اپنی وفاداری کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے قرآن و خانۂ کعبہ کی بے حرمتی کرنے سے باز نہ آئیں۔

بھلا ان مسلم وزیروں سے ہندوستانی مسلمان اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی مسلمان بیحد پست ہمت ہو گئے تھے اگر مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے بیباک اور بے خوف رہنما انھیں نہ ملتے تو شاید وہ عزت کی موت کی طرف بھی نہیں لوٹ پاتے ان رہنماؤں نے انھیں زندگی کی طرف نہیں بلکہ عزت کی موت کی طرف بلایا تھا۔ کانگریس کے تیس سالہ دور حکومت نے مسلمانوں کو صرف جینے کا حق دیا لیکن ان کی بہت بڑی قیمت دنیا کی شاید کسی اقلیت سے وصول نہیں کی گئی ہو۔ اس تیس سالہ دور میں جہاں ہریجن اور آدیباسیوں کے معیار زندگی کو اٹھانے کی کوشش کی گئی وہیں دوسری جانب مسلمان پسماندہ ہوتے چلے گئے اور ایک نئی ہریجن آبادی کا جنم ہو گیا۔ کیا اس سے بڑی کوئی اور قیمت ان سے وصول کی جا سکتی تھی۔ نوکری کا تناسب دن بدن کم ہوتا چلا گیا کہنے کو تو برابر کے حقوق دیئے گئے لیکن برتنے میں وہ دو نمبر کے شہری ہی ہوتے چلے گئے۔ آج سرکاری دفتروں میں چلے جایئے مسلمان خال خال اور برائے نام ہی نظر آئیں گے۔ اور بعض دفتروں میں تو کسی مسلمان کا پتہ ہی نہیں چلے گا —— ان سب کے باوجود مسلمان تیس سالوں تک کانگریس کے بیدام غلام بنے رہے۔ لیکن گذشتہ پارلیامانی الیکشن میں انھوں نے دوسرا فیصلہ کیا۔ جب کانگریس انھیں جن سنگھ اور آر ایس ایس کا ہوا دکھا کر خوفزدہ کرتا تھا تو وہ بے خوف ہو کر کہتے تھے کہ چھپے دشمن سے کھلا دشمن زیادہ بہتر ہے۔ آخر کار کانگریس کا تیس سالہ دور حکومت ختم ہوا۔ لیکن چھپے دشمن سے کھلا دشمن زیادہ ہی بدتر ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے سمجھا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت دیدیں گے تو یہ ذمہ داری محسوس کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نام پر جو وزیر بنائے گئے وہ کانگریسی دور کے مسلم وزیروں سے بھی بدتر ثابت ہوئے۔ کانگریسی مسلم وزیر اگر اندھے، گونگے، بہرے تھے تو آج جنہیں مسلمانوں کی نمائندگی کا شرف بخشا گیا ہے وہ قطعی طور پر مفلوج اپاہج، لولے اور لنگڑے بھی ہیں۔ ایسی حالت میں عام مسلمان کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ اپنی بپتا کس سے کہیں حالانکہ یہ وہ مسلمان وزیر ہیں جو کانگریسی دور کے مسلم وزیروں پر سخت تنقید کیا کرتے تھے اور قوم وملت کے مسائل کو پس پشت ڈالنے کے الزامات عائد کیا کرتے تھے لیکن یہ ان کے مقابلے میں کہیں بدتر ثابت ہوئے۔ کانگریس نے مسلمانوں کی دلآزاری کیلئے اگر چھاگلہ اور نورالحسن پیدا کئے تو جنتا پارٹی کے دور میں سینکڑوں چھاگلہ اور نورالحسن پیدا ہو گئے۔ یہ سب انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ کل قوم وملت اور اردو کیلئے اپنی جان نچھاور کرنیوالے دعوے دار آج گوشہ نشیں بن کر دن رات اپنی کرسی بچانے کی فکر میں ان معاملات کو الجھاتے جاتے رہے ہیں۔ شاید یہ اپنے حشر سے واقف نہیں ہیں انھیں پتہ نہیں کہ کل انھیں بھی سڑک پر آنا پڑے گا۔ ان کلینا مزا مسلمانوں کے ساتھ ہوگا اور کل کوئی مسلمان ان کے در پر تھوکنے بھی نہیں جائے گا۔ اٹھتے بیٹھتے قوم کی دلآزاری کی سزا انھیں ضرور ملے گی۔

مسلمان وزیروں نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے اہل نہیں ہیں۔ انھیں مسلمانوں کے مفادات سے دلچسپی نہیں ہے۔ یہ ملت کی امنگوں، آرزوؤں کی آئینہ داری نہیں کرتے بلکہ ان کے جذبات واحساسات کی دلآزاری کرتے ہیں۔ ان کی آرزوؤں کو کچلتے ہیں۔

آج ہندوستانی مسلمان تاریخ کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھیں تاریخی فیصلے کرنے ہیں ورنہ وقت انھیں ٹھوکر مار کر ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں دھکیل دے گا۔ انھیں اپنے ان رہزن نما رہنماؤں سے منہ موڑ کر کچھ فیصلہ کن قدم اٹھانے ہوں گے تاکہ کل انھیں پچھتانا نہ پڑے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوستانی مسلمان قیادت کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور ان کے قافلے رہبر رہزن لوٹ لیتے ہیں۔ کتنی بے چارگی ہے۔ کتنی بے بسی ہے کیسی بے کسی ہے۔؟

ہندوستانی مسلمان کا ذہن ملک کی تعمیر میں لگنے کے بجائے تارِ عنکبوت میں الجھتا جا رہا ہے اور ان کے سامنے صرف سوال ہی سوال ہیں۔

۲۷ اگست ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بیسویں صدی کے یہ سفاک راون

جب ہر سال راون کو جلا دیا جاتا ہے تو پھر بار بار یہ کیوں زندہ ہو جاتا ہے اور عفریت کی طرح اپنا شیطانی رقص شروع کر دیتا ہے۔

رام کی دھرتی پر یہ راون کا ننگا ناچ کیوں ہو رہا ہے؟

یہ بربریت، یہ بہیمیت، یہ اخلاق سوزی رقص ابلیس نہیں ہے تو کیا ہے؟

ہر برس وجے دسمی کے موقع پر راون کا بلند و بالا پتلا جلا کر ہم یہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ راون کا ناش ہو گیا وہ آگ میں جل کر ختم ہو گیا لیکن ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ عفریت اب انسانوں کے ذہن میں گھس کر بیٹھ گیا ہے۔ انھیں ورغلاتا رہتا ہے اور ملک کو مسلسل تباہی و بربادی کی جانب لے جا رہا ہے۔

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے اکتیس سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا۔ یہ عرصہ آج کی تیز رفتار زندگی میں کم نہیں ہے لیکن ہم محض نام کے لئے آزاد ہوئے۔ ذہنی غلامی، افلاس، احساس کمتری اور خود فریبی کی زنجیریں توڑ کر آزاد نہیں ہوئے یہی وجہ ہے کہ گذشتہ سال جب پارلیامنٹ کا الیکشن ہوا تو عوام نے کانگریس کا جوا بھی اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس عرصہ میں ملک کی بہت ترقی ہوئی ہے۔ ملک نے ارتقاء کی بہت سی منازل طے کی ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاستدانوں نے غریب

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عوام کا محض استحصال کیا ہے۔ خود بہت کچھ لیا ہے لیکن انھیں کچھ نہیں دیا ہے۔ رہنماؤں نے اکثر و بیشتر رہنمائی کرنے کے بجائے رہزنی کی ہے۔ عوام جنہوں نے اپنے ان رہنماؤں سے پرستش کی حد تک محبت کی تھی لیکن اپنی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے ان کی نظروں سے گر گئے۔ آخر عوام ان سے اس قدر بدظن ہو گئے کہ انھوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کیلئے اقتدار کی کرسیوں سے انھیں ایک لمحہ میں اتار پھینکا۔ مگر اقتدار کا جوا ہی اپنے کاندھوں سے اتار پھینکنا کافی نہیں ہوتا۔ کیونکہ محض اقتدار کی تبدیلی سے کوئی انقلاب رونما نہیں ہوتا۔ وہ "مکمل انقلاب" تو محض فریب تھا، دھوکا تھا، سراب تھا۔ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اس لئے وہ انقلاب آیا ہی نہیں اور نہ اس کے آنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اب سوال سب سے بڑا یہ ہے کہ یہ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ذہنی انقلاب لایا کیسے جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کی ترقی رکتی رہے گی۔ اس نام نہاد و مکمل انقلاب کی نقیب حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے ملک میں بدامنی انارکی کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس نے عوام کو ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ عوام اب سوچ رہے ہیں کہ آخر انھوں نے کیا کر ڈالا۔ وہ کیا کرنا چاہتے تھے اور کیا کر ڈالا۔ انھوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوا۔ ان کے خوابوں کے شیش محل کس طرح چکنا چور ہوئے۔ ان کے خوابوں کی حقیقت کتنی بھیانک نکلی۔ انھوں نے جنہیں اپنا نیا رہنما بنایا وہ سابقہ رہنماؤں سے بھی زیادہ رہزن نکلے۔ اب محض ڈیڑھ سال کی مدت میں ہی عوام اس حکومت سے اکتا چکے ہیں کیونکہ ایسی حالت میں عوام میدان عمل میں نکل آئیں گے اور عوامی مخالفت کے سامنے کوئی بھی حکومت ٹھہر نہیں سکتی۔

ہر سال راون کے ہزاروں پتلے جلائے جاتے ہیں۔ لیکن کیا ہم نے کبھی بیسویں صدی کے ان خطرناک، خوفناک اور خونخوار راونوں کے بارے میں بھی سوچا ہے جنہوں نے عوام پر

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ جن کی بربریت کا ننگا ناچ مستقل جاری ہے لیکن آج بھی راونوں کی آمد کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔ آخر کون رام بن کر ان کا بدھ کرے گا؟ قدیم راون طاقت، علم و حکمت کا منبع تھا۔ آج کے راون بھی اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں، کوٹھیوں، محلوں اور حویلیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس اقتدار کی بے پناہ طاقت ہے۔ انھیں قانونی تحفظ بھی حاصل ہے اور ان کی مٹھیوں میں ہزاروں، لاکھوں عوام کی تقدیر بھی بند ہے پر ایسی حالت میں ان پر کون دار و گیر کر سکتا ہے۔ ان کے اقتدار کو کون چیلنج کر سکتا ہے۔ انھیں ان کی بدکاریوں کا آئینہ کون دکھا سکتا ہے۔ اس کیلئے پھر کسی 'رام' کی ضرورت ہے۔

افسوس! کہ ہمارے موجودہ حکمرانوں نے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر سادگی، سچائی اور پاپو کے اصولوں کو اپنانے کی قسم کھائی تھی، مہاتما گاندھی کا فلسفہ تھا 'رام راجیہ' مگر ہوا کیا؟ سبھی جانتے ہیں کہ ملک میں رام راجیہ کے بجائے راون راجیہ ہو گیا۔

روزانہ کیا ہو رہا ہے؟ لوٹ مار، چھینا جھپٹی، قتل و غارت گری، آگ و خون اور بربریت و شیطنیت کا دردناک کھیل۔ اور اس کھیل سے ضرور کوئی لطف اندوز ہو رہا ہے ورنہ اس کے تادیر جاری رہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں آتی ہیں۔ کسی کی جان و مال و عزت محفوظ نہیں ہے طاقت ور کمزور پر خنجر بکف ہے یہ ملک جس نے دنیا کی رہنمائی کی تھی اب خود دست نگر بنتا جا رہا ہے۔ آپسی نفرت اور پھوٹ نے اسے غلط راستوں پر ڈال دیا ہے۔

راون اور رام کی جنگ صرف اصولوں کی جنگ نہیں تھی، یہ جنگ نیکی کی قوت کے مقابلے میں بدی کی طاقت کی جنگ تھی لیکن اس جنگ میں نیکی کی فتح ہوئی تھی۔ راون اپنے بہت بڑے لاؤ لشکر، بے پناہ علم و حکمت کے باوجود شکست کھا گیا تھا۔ مگر نہیں کہا جا سکتا کہ آج کیا ہوگا۔ کیا بیسویں صدی کے ان بے تاج بادشاہوں اور راونوں کے مقابلے میں کمزوروں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کو فتح نصیب ہو سکے گی۔ کیا آج کی بدی کی قوتوں سے نیکی کی قوتیں جس طرح سے نبرد آزما ہیں انھیں کامیابی حاصل ہوگی۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بدی کی قوتوں کے پلڑے میں آج بہت کچھ ہے اور ان کے خلاف نبرد آزمائی کرنیوالے لہولہان ہیں۔ ان کا وجود چور چور ہے شکست خوردہ و دل گرفتہ ہے اگر انھیں طاقت نہ ملی تو شاید دلبرداشتہ ہو کر یہ اپنی جد و جہد چھوڑ دیں۔ اور شائد اس صدی کی اس سے بڑی کوئی بدقسمتی نہ ہو۔

راون کے صرف دس سر تھے، بیسویں صدی کے راون جدید آلاتِ حرب سے لیس ہیں۔ ان کے ہزار در ہزار سر ہیں۔ یہ ساری دنیا کو جہنم زار بنانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ جنگ زرگری، ان کی توسیع پسندی، اقتدار پرستی عام انسان کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ ساری دنیا دکھ سے بلک رہی ہے، کراہ رہی ہے لیکن یہ اپنے شبستانوں اور ایوانوں میں غریبوں کا لہو چوس کر جشن عیش و مسرت منا رہے ہیں۔ اپنے عیش و آرام کے لئے یہ ساری دنیا کو نفرت کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔ آج کے راون اپنے بنائے ہوئے ان راستوں پر اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب ان کی واپسی ممکن نہیں ہے یہ بات ان کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ دنیا کی فلاح راون کے راستے میں نہیں رام کی پیروی کرنے میں ہے۔

ہم محض علامتوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور حقیقتوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ راون کو صرف علامتی طور پر جلا دینا کافی نہیں ہے۔ آج بیسویں صدی میں جو ہزاروں راون پیدا ہو گئے ہیں انھیں ختم کرنا ضروری ہے ورنہ وہ ہمارے ہندوستان جنت نشان کو جہنم زار بنا دیں گے۔

(وجے دشمی کے موقع پر)

۸ر اکتوبر ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین ؟

بالآخر ۱۹ دسمبر کو شری متی اندرا گاندھی کو پارلیامنٹ کی رکنیت سے خارج کر کے جیل بھیجدیا گیا۔ انھیں بحیثیت وزیر اعظم مراعات کا بیجا استعمال کرنے اور ایوان کی توہین کا مرتکب ہونے کا مجرم پایا گیا تھا۔

موجودہ جنتا حکومت کو لوک سبھا میں زبردست اکثریت حاصل ہے اس لئے اس کے لئے تجویز کو پاس کروانا بالکل آسان تھا اور وزیر اعظم کے ذریعہ پیش کردہ تجویز ۱۳۸ کے مقابلے ۲۷۹ ووٹوں سے پاس ہوگئی۔ سی۔ پی۔ ایم اور فارورڈ بلاک کے ممبران نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔

جمہوری عدالت میں پارلیامنٹ ہی سپریم ہے اس لئے اس کا فیصلہ ہر شخص کو بے چوں وچرا تسلیم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شری متی گاندھی نے فوری طور پر پارلیامنٹ کے فیصلے کو تسلیم کر لیا ساتھ انھوں نے اس کا بھی اعلان کیا کہ وہ پھر چک مگلور سے پارلیامنٹ کا الیکشن لڑیں گی۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے انھیں روکنے کا اختیار پارلیامنٹ کو نہیں ہے۔

اس تجویز کے پاس ہونے سے قبل پارلیامنٹ کے کئی ممبران نے تقریریں کیں اور کانگریس و کانگریس آئی کے علاوہ جنتا پارٹی کے ممبران نے بھی حکومت کو انتہا پسندانہ اقدام اٹھانے سے گریز کرنے کی صلاح دی تھی۔ شری وائی۔ بی۔ چوان نے تو یہ تک کہا کہ اگر شری متی گاندھی کو خارج کر دیا جاتا ہے اور وہ پھر چک مگلور سے ہی لوک سبھا کا چناؤ جیت کر واپس آجاتی،

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں تو ایوان کے فیصلے کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جائے گی۔ شری متی گاندھی نے اس اقدام کو ذاتی بغض و عناد سے تعبیر کیا۔

وجہ جو بھی ہو بہر حال کسی نے جرم کیا ہے تو اسے سزا ملنی چاہئے کیونکہ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا لیکن اس میں ذاتی بغض و عناد کا کوئی عنصر شامل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص ذاتی بغض و عناد کے تحت ان معزز اداروں کا استعمال کرتا ہے تو یقیناً ایسے اقدام کی مذمت ہونی چاہئے۔

اس مباحثے کے دوران بعض نکات جو سامنے آئے ہیں وہ یقیناً قابل غور ہیں اور اہم بھی۔ سوال یہ ہے کہ شری متی اندرا گاندھی نے وزیر اعظم کے عہدے کا غلط استعمال کیا تو اس وقت وہ رائے بریلی (اتر پردیش) سے پارلیامنٹ کی ممبر تھیں۔ وہاں کے عوام نے انھیں منتخب کر کے بھیجا تھا۔ لیکن گذشتہ الیکشن میں وہیں کے عوام نے انھیں شکست سے دوچار کر کے سزا بھی دیدی۔ پھر اب یہ سزا کیسی۔ جمہوریت میں تو عوام ہی سب سے مقدم ہوتے ہیں پھر یہ دوہری سزا کیسی؟ دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ کانگریسی حکومت کو بھی عوام ہی منتخب کر کے لائے تھے اور اس نے جو کام کئے انھیں عوامی حمایت حاصل تھی جس طرح آج جنتا حکومت کو حاصل ہے تو کیا موجودہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سابقہ حرکات و سکنات کا جائزہ لے کر سزائیں تجویز کرے؟ اگر ایسا ہوا تو ہر آنے والی حکومت سابقہ حکومت کے خلاف اسی طرح کی کارروائیاں کر کے غلط روایات قائم کرتی رہے گی؟

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ گذشتہ ماہ ہی چک منگلور کے عوام نے اپنی نمائندگی کے لئے شری متی اندرا گاندھی کو منتخب کر کے پارلیامنٹ میں بھیجا تھا۔ لیکن جنتا حکومت نے اپنے ممبران کی اکثریت کی بنا پر تجویز پاس کر کے انھیں ایوان سے باہر نکال دیا۔ تو کیا اس سے ان لاکھوں عوام کے جذبات کی توہین نہیں ہوتی جنھوں نے شری متی گاندھی کو منتخب کر کے انھیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا اور انھیں ان عوام کی نمائندگی کرنے کے بجائے ایوان سے باہر نکال دیا گیا۔
عوام پارلیامنٹ سے ہیں یا پارلیامنٹ عوام سے ہے؟ عوام ہی پارلیامنٹ کو منتخب کرتے ہیں جو جمہوریت کا سب سے بڑا شرف ہے ایسی حالت میں کیا یہ حق عوام کو نہیں ملنا چاہیئے کہ جو ممبر اپنے حلقے کی عوام کی حمایت سے محروم ہو جائے اسے واپس بلا لیا جائے۔ اس وقت میں ۱۹۷۴ء کی جے پرکاش نرائن کی اس تحریک کی یاد دلانا چاہتا ہوں جس کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی تھا کہ عوام کو یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے منتخب کردہ ممبر کو وقت سے قبل بھی واپس بلا سکیں اگر اس نے عوامی حمایت کھو دی ہو۔ ظاہر ہے کہ ہمارے موجودہ حکمراں یہ مانگ کرنے میں پیش پیش تھے۔ جنتا حکومت کو بنے دو سال ہونے والے ہیں لیکن کسی بھی ممبر نے یہ مانگ نہیں کی ہے کہ عوام کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ اپنے نمائندے کو واپس بلا سکیں۔ خود جے پرکاش نرائن نے ایک دفعہ بھی جنتا حکومت سے یہ مانگ نہیں کی ہے کہیں ان کی یہ مانگ ایک ڈھکوسلہ ہی تو نہیں تھی؟
شری متی اندرا گاندھی کی گرفتاری کے بعد پرتشدد واقعات کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو بیحد افسوسناک ہے۔ شر پسند عناصر سرکاری املاک کو نقصان پہونچا رہے ہیں اور انتشار برپا کرتے ہیں وہ ملک کے مفاد کو نقصان پہونچاتے ہیں اور ایسا کرنے والوں کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیئے۔ شری متی اندرا گاندھی کی گرفتاری کے ایک روز بعد ایک طیارے کا اغوا کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرکت کا مطلب تخریب پسندی کے سوا اور کچھ نہیں یہ لوگ کسی بھی پارٹی کے ممبر ہوں یہ اس ملک کے دوست نہیں ہو سکتے ایسے افراد کو سخت سے سخت عبرتناک سزا دی جائے۔ آخر ان مسافروں نے کون سا جرم کیا تھا؟ لیکن بڑا سوال تو یہ ہے کہ انھیں سزا کون دے گا جب کہ یہ حکومت ہی پرتشدد تحریک چلا کر اقتدار میں آئی ہے ۱۹۷۴، ۷۵ء گذرے ابھی دیر تو نہیں ہوئی ابھی نہ جانے کتنی سرکاری عمارتیں اس تحریک کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ جن کو جلا کر خاک کر دیا گیا تھا۔ بعد ایک لیڈر نے تو فخریہ بیان کیا کہ اس نے ۴۸ ٹرینیں الٹ دی تھیں اور شاید یہ اس بیسویں صدی کی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سب سے حیرتناک خبر ہے کہ اسے اس جرم پر جیل نہیں بھیجا گیا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ سزا نہیں دی گئی بلکہ وزیر بنا دیا گیا۔ اقتدار سونپ دیا گیا ـــــ جن کو جیل میں ہونا چاہئے تھا جب ان کے ہاتھوں میں جیل کی کنجی آجائے گی تو انجام کیا ہوگا؟ آخر اس تشدد کی مذمت کون کرے گا؟ کون اسے روکے گا؟ کیونکہ کل تک جنہوں نے غارت گری، بربادی اور تشدد کی ہمت افزائی کی ہو وہ کس منہ سے اس کی مذمت کر سکتے ہیں؟ ـــــ تشدد کی یہ لہر ختم نہ ہوئی تو پتہ نہیں یہ ملک کس طرف جائے گا۔

مسز اندرا گاندھی کو ایوان سے خارج کرنے اور گرفتار کرنے سے زیادہ اہم مسئلے ہیں مگر شائد حکومت کو ان کی جانب توجہ دینے کی فرصت بھی نہیں ہے۔ ملک میں بیروزگاری بڑھ رہی ہے۔ غربت و افلاس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ترقی کی رفتار سست ہو گئی ہے بیکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے حکومت کا کام عوام کو روٹی کپڑا اور روزگار کے مواقع دینا ہے لیکن ان کا مطالبہ کرنے پر وہ صرف کمیشن بنا دیتی ہے اور ان کمیشنوں پر قوم کا کروڑوں روپیہ برباد ہو گیا جن سے ملک کی ترقی کے بہت سے کام ہو سکتے تھے۔ ان کمیشنوں سے عوام کو کیا حاصل ہوا؟ حکومت کو اس بات پر تشویش ہے کہ مسز گاندھی پھر واپس آرہی ہیں لیکن وہ یہ غور نہیں کرتی کہ کیوں واپس آرہی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مسز گاندھی جن کو اور جن کی پارٹی کو عوام نے رد کر دیا تھا انھیں پھر سے واپس لانے کی ذمہ داری جنتا حکومت پر ہی ہے جس نے شروع سے ہی عوام دشمن پالیسیاں اختیار کر رکھی ہیں۔ کوئی پارلیامنٹ کے اندر رہے ہیں یا باہر اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا کیونکہ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے عوام چاہیں۔ عوام کیا چاہتے ہیں اسے موجودہ حکومت بھی جانتی ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۷۸ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

زمین سخت ہے، آسمان دور ہے

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ نیم تہذیب یافتہ معاشرہ ہے اور اسی وجہ سے بہت سے ایسے تصورات اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے یہاں یہ بات مان لی گئی ہے کہ ادیب، شاعر، تخلیق کار، فن کار، صحافی اور اہل قلم کو مفلسی کی زندگی گذارنی چاہئے یہ تصور عام ہے کہ جب پیٹ بھوکا ہو، انتڑیاں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہوں، جسم نقاہت کی آخری انتہا کو پہونچ گیا ہو، جسم پر چیتھڑے ہوں، بستر زمین اور چھت کھلا آسمان ہو تبھی کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے پتہ نہیں یہ غلط تصور کیوں عام ہو گیا ہے معلوم نہیں یہ بات کس نے مشہور کر دی کہ تخلیق کار کا غریب ہونا لازمی ہے۔

یہ ہمارے سماج، ہمارے معاشرے اور ہمارے ملک کا عجیب و غریب مسئلہ ہے جس پر نہ اب تک سوچا گیا ہے اور نہ کچھ اس سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ تخلیق کاروں کا ہے۔ ہر طبقے اور فرقے کے لئے ملازمتوں میں ریزرویشن کئے جا رہے ہیں، پس ماندہ ذاتوں کے لئے ہر میدان میں نشستیں مخصوص کی جا رہی ہیں۔ لیکن کچھ نہیں ہو رہا ہے تو بیچارے تخلیق کاروں کے لئے حالانکہ ان کی اقتصادی حالت بہت ابتر ہے اور یہ ہر لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ اس میں کسی زبان کی تخلیق کاروں کی تخصیص نہیں ہے۔ تقریباً ہندوستان کی ہر زبان کے بیشتر ادیب و شاعر پس ماندہ ہیں لیکن اردو کے ادیبوں کے حالات کچھ زیادہ ہی درد

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ناک ہے۔ سب سے افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہندوستان کا قلم کار قلم کے سہارے روزی حاصل نہیں کر سکتا اسے گھر کا خرچ چلانے کے لئے کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہے کہ ملازمتوں میں کھلاڑیوں کو تو رعائتیں دی جاتی ہیں اور ان کیلئے نشستیں مخصوص کیجاتی ہیں لیکن کسی تخلیق کار کو یہ آسانی بھی نہیں دی جاتی۔ ساری ذہنی توانائی صرف کر کے وہ جو تخلیق کرتا ہے اسکی اس سٹ اپ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

آج تک اس سلسلہ میں نہ کوئی آواز اٹھائی گئی ہے اور نہ کوئی اقدام کیا گیا ہے۔ حکومت کے ایوانوں میں بھی تخلیق کاروں کی نمائندگی معمولی ہے۔ جو ادیب و شاعر حکومت کے ایوان میں ہیں وہ اس مسئلے پر کچھ بولتے ہی نہیں کیونکہ وہ تخلیق کار سے زیادہ سیاست داں بن چکے ہوتے ہیں اور اپنی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اپنی ساری برادری کو بھول ہی جاتے ہیں جو تخلیقی کرب کے علاوہ معاشرتی کرب سے بھی دوچار رہتی ہے۔

اردو کے بیشتر تخلیق کار یہ کام محض شوقیہ انجام دیتے ہیں یا جب تخلیقی کرب سے مجبور ہو جاتے ہیں تو کاغذ قلم کا سہارا لے لیتے ہیں جس کا انھیں کچھ بھی منافع نہیں ملتا ہے۔ صرف ترسیل کے شوق میں اعزازی طور پر کسی پرچے میں اسے چھپوا بھی لیتے ہیں۔ مالی حالات صرف انھیں تخلیق کاروں کے اچھے ہیں جو کسی دوسرے پیشے سے منسلک ہیں یا پھر انھوں نے خود کو پیشہ ور بنا لیا ہے۔ کسی میں ادیب یا شاعر بننے کی اچھی صلاحیت تھی تو وہ پیٹ سے مجبور ہو کر اخبار سے منسلک ہو گیا۔ کسی نے جاسوسی، تفریحی اور فحش ناول لکھنے شروع کر دیئے۔ ہمارے بہت بڑے ادیب آنجہانی کرشن چندر بھی اپنے تخلیقی فن سے کچھ حاصل نہ کر سکے اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر جاسوسی و تفریحی ناول لکھنے لگے تھے۔ ہمارے بہت سے اچھے قلم کاروں کے ساتھ یہی حادثہ ہوا۔ جس نے فن کو بچانے کی کوشش کی وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور خون تھوک تھوک کر مر گیا۔

آج ہمارے بہت سے فنکار ان حالات سے دوچار ہیں۔ حالانکہ حکومت نے تخلیق کاروں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کی مدد کیلئے اردو اکادمیاں اور کئی ادبی ادارے بنائے لیکن افسوس کہ چھچھورے اور کم ظرف سیاست دانوں کی وجہ سے ان پر "بے لوبوں" کا قبضہ ہو گیا ہے اور اب وہ تخلیق کاروں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ادب کی توہین کر رہے ہیں۔

کوئی ہمارے تخلیق کاروں کی مطبوعات چھاپنے کو تیار نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پبلشر ہی نہیں ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبان کے ادیبوں نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا ہے کہ انھوں نے ادیبوں کی امداد باہمی انجمنیں بنا کر حکومت سے قرض لئے ہیں اور آسانیاں حاصل کی ہیں۔ وہ اپنی زبان کے ادیبوں شاعروں کی مطبوعات چھاپتے ہیں انھیں رائلٹی دیتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ پورے ہندوستان میں ابتک اردو ادیبوں کی کوئی امداد باہمی انجمن نہیں بن سکی ہے۔ کیا ہماری برادری میں ایک بھی ایسا جیالہ نہیں ہے جو آگے آئے اور اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے۔

سب سے پہلے تو ہمیں اردو ادیبوں کی ایک موثر انجمن بنانی چاہئے جو حکومت کے سامنے ہمارے مطالبات رکھ سکے۔ اردو کے تخلیق کاروں کو جینے کا حق دلا سکے۔ پھر مکانات کا معاملہ ہے۔ ادیبوں کو کم داموں پر زمین اور مکانات دیئے جائیں دوا علاج کی آسانیاں فراہم کی جائیں۔ ثقافتی وفود میں اردو ادیبوں کو بھی شامل کیا جائے۔

یہ بہت سے مسائل ہیں لیکن بنیادی مسئلہ روزی روٹی کا ہے۔ ہمیں ان پر مل بیٹھ کر سوچنا چاہئے۔ غور و فکر کرنی چاہئے اور ان کا حل تلاش کرنا چاہئے۔

کاش کہ کسی جانب سے اردو ادیبوں کی کانفرنس بلانے کی بھی آواز اٹھے اور اس میں ادبی مسائل کے علاوہ ان روزمرہ کے مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا جائے۔

میری اردو کے تمام تخلیق کاروں سے درخواست ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچیں اور جنکے پاس وسائل ہیں وہ کچھ اقدام کریں۔ یہ اس برادری کی سب سے بڑی خدمت ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ••

۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سُرخیاں خون میں ڈوبی ہیں سب اخباروں کی

فولاد کے شہر جمشید پور میں تین دنوں تک نہایت ارزانی سے انسانی خون بہتا رہا۔ جہاں ہمیشہ سرخ سرخ اسپات پگھل کر بہتا ہے وہاں سرخ سرخ خون بہتا رہا سینکڑوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ سینکڑوں گھر جلا ڈالے گئے۔ آگ کی سرخ اور بے رحم زبان بستی کو چاٹ گئی اور پل بھر میں کتنوں کی دنیا ویران ہو گئی کتنی بیویوں کا سہاگ اجڑ گیا۔ ماں باپ، بھائی، بہن مارے گئے، گودیں ویران ہو گئیں، مانگیں سونی ہوئیں اور بہیمیت و حیوانیت کا یہ رقصِ ابلیس تین دنوں تک جاری رہا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا بھیانک ترین فساد تھا۔ اس بدقسمت ملک میں آزادی کے بعد سے ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں۔ جمشید پور میں بھی فساد کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ۱۵ سال قبل بھی یہاں بھیانک فساد ہوا تھا لیکن اس کا روپ اتنا کروہ نہیں تھا۔ اتنا بھیانک نہیں تھا۔ اس فساد نے سارے رکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ ابھی محض چار ماہ قبل ہی تو علی گڈھ کا فساد ہوا تھا لیکن علی گڈھ کا فساد طویل وقفے کا تھا وہاں جو کچھ تین ماہ میں نہیں ہوا وہ جمشید پور میں تین دنوں میں ہو گیا۔ ویسے جمشید پور کا فساد بالکل ہی سرد نہیں ہوا وہاں اب بھی چنگاری سلگ رہی ہے کچھ شر پسند اس بات کیلئے کوشاں ہیں کہ پھر وہاں فساد پھوٹ پڑے، اگر کڑی نگاہ نہ رکھی گئی تو کوئی عجب نہیں کہ آگ پھر بھڑکے اور شر پسند و مفاد پرست اسے ہوا دے کر شعلہ جوّالا بنا دیں۔ کچھ سماج دشمن ہمیشہ ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہندوستان کے کسی بھی خطے میں جب فساد ہوتا ہے، سیکولرزم کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر فساد میں ایک ہی جیسا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے، ایک ہی جیسے کردار ہوتے ہیں اور ہمیشہ ایک ہی ردعمل ہوتا ہے۔ بات کسی مذہبی جلوس کی ہوتی ہے اس پر کوئی پتھر یا بم پھینک دیا جاتا ہے اور سینکڑوں انسانوں کی جانیں جاتی ہیں۔ ہر پارٹی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتی ہے۔ فساد کے بعد تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیا جاتا ہے جس کی رپورٹ ہمیشہ سرد خانے میں ڈال دی جاتی ہے اور اسے کبھی شائع نہیں کیا جاتا ہے۔ یہی سب کچھ تو ہوتا ہے۔

فسادات کانگریس دور میں بھی ہوئے تھے اور جنتا دورِ اقتدار میں بھی ہو رہے ہیں۔ گذشتہ پارلیامانی انتخابات میں مسلمانوں نے ایک نیا تجربہ کر ڈالا وہ کانگریس کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے جنتا پارٹی کی جانب توجہ دی۔ حالانکہ انھیں اس وقت کے لیڈران نے کافی ڈرایا دھمکایا کہ جنتا پارٹی اگر برسر اقتدار آگئی تو آر۔ ایس۔ ایس بالواسطہ طور پر اقتدار پر قابض ہو جائے گی اور یہ مسلمانوں کی دشمن نمبر ایک ہے۔ لیکن مسلمانوں نے سوچا کہ ایک نیا تجربہ کر ڈالا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ چور کے ہاتھوں میں رکھوالی کا کام دیدیا جائے تو وہ ذمہ دار بن کر زیادہ بہتر کام کرے۔ آزادی کے بعد سے ابتک ہر فساد میں سنگھ کو ملوث بتایا گیا ہے لیکن اس کے رہنما اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس الزام کو دھونے کے لئے انھوں نے کچھ کیا نہیں ہے۔ مثلاً جمشید پور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فساد سے صرف چار روز قبل تک وہاں آر۔ ایس۔ ایس کا کیمپ اور ٹریننگ چل رہی تھی۔ سنگھ کے سربراہ بالا صاحب دیورس بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے انھوں نے اشتعال انگیز اور قابل نفرت تقریریں بھی کیں۔ اشتعال بھی دلایا اور انجام کار یہ ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جمشید پور میں جماعت اسلامی نے بھی بالا صاحب دیورس کو ایک استقبالیہ دیا تھا۔ اس میں دو پروفیسر صاحبان نے انھیں فونٹن پن کا تحفہ بھی دیا تھا۔ لیکن یہ ساری باتیں کس کام کی جب دلوں میں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کیسنہ ہے؟ جس طور پر جلوس نکالنے کا اجازت نامہ حاصل کیا گیا وہ حکومت کیلئے شرم کی بات ہے۔ شری کرپوری ٹھاکر اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ حالانکہ ۱۹ اپریل کو شری کرپوری ٹھاکر زور آزمائی میں ہار گئے اور اب انھوں نے رٹ لگا رکھی ہے کہ آر۔ ایس۔ ایس کو ہٹاؤ۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ ۱۹ اپریل تک شری کرپوری ٹھاکر کیلئے آر۔ ایس۔ ایس۔ اچھی تھی جس کے ساتھ انہوں نے وزارت بنا رکھی تھی لیکن ۱۹ اپریل کے بعد اچانک ہی بری کیسے ہو گئی؟

یہ فسادات نہ صرف ملک کے لئے ایک سنگین مسئلہ اور بڑا سوالیہ نشان ہیں بلکہ اس سے ہندوستان کی پوری دنیا میں بدنامی ہوئی ہے دوسرے ملک کے عوام بھی یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستان میں نہ صرف اقلیتوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، انھیں نوکریوں سے الگ رکھا جا رہا ہے اور ان کی املاک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ انھیں معاشی طور پر برباد کیا جا رہا ہے۔

ان فسادات نے مسلمانوں میں خاص طور پر عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگے ہیں ان کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ رہنما راہزن بن کر انھیں لوٹ رہے ہیں۔ لیکن یہ بڑا اہم سوال ہے کہ ہندوستانی مسلمان کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ کیا مسلمان اپنا کیس اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی کے سامنے لے جائیں کہ انھیں دھیرے دھیرے انسانی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے؟ لیکن یہ کام کون کرے گا۔ اس قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے پاس قیادت کا بحران ہے اس کی شیرازہ بندی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سب صرف استحصال کرنے والے ہیں۔ مسلمانوں کا ہر لیڈر مفاد پرست ہے۔ ہر ایک کی قیمت مقرر ہے۔ سبھی بک جاتے ہیں، حکومت ان کی قیمت ادا کر کے خرید لیتی ہے اور انھیں مٹی کا مادھو بنا کر رکھ دیتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج مسلمانوں کے پاس قیادت نہیں ہے وہ قیادت کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

جب بھی فساد ہوتا ہے تو ایک شور اٹھتا ہے اور سبھی کچھ نہ کچھ کہہ جاتے ہیں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے اور پھر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن تلوار تو ہر وقت سروں پر لٹک رہی ہے۔ کسی وقت بھی سر کٹنے کی نوبت آسکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس وبا کا کچھ مستقل تدارک تلاش کیا جائے۔ یہ انسانی خون کی ارزانی پوری دنیا میں ہندوستان کو بدنام کر رہی ہے جمہوریت محض اکثریت کے لئے ہی نہیں ہوتی اقلیت کے لئے بھی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے سلسلہ میں حکومت کی بے حسی بہت ہی افسوسناک ہے۔ دوسروں کی طرح مسلمان بھی اس ملک کے شہری ہیں لیکن ان کے ساتھ تفریق برتی جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے مثلاً جمشید پور میں بی۔ ایس۔ ایف اور بی۔ ایم۔ پی تعینات کی گئی تھی اس میں اگر قابل لحاظ تعداد مسلمانوں کی بھی ہوتی تو کیا وہی واقعہ پیش آتا جو کہ وہاں پیش آیا اس فساد کا مکروہ ترین پہلو یہ ہے کہ بی۔ ایس۔ ایف اور بی۔ ایم۔ پی کے جیالوں نے مسلمانوں کے گھروں پر بھی حملے کئے اور انھیں پکڑ کر گولی مار دی۔ ان کی املاک لوٹ لیں۔ اسی لئے مسلمانوں کو اب زیادہ محتاط رہنا ہے۔ کیوں کہ پچھلے الیکشن کا تجربہ بہت ہی تلخ رہا ہے بلکہ اسے نام کا بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہر دو چار مہینوں پر فرقہ وارانہ فساد کا پھوٹ پڑنا حکومت کی غیر ذمہ داری اور کمزوری پر دلالت کرتا ہے اگر اس پر بھی کان پر جوں نہیں رینگتی ہے نہ ہوش کے ناخن لیتے ہیں تو حکومت کو کیا پڑی ہے کہ اسکے ساتھ ہمدردی کرے کوئی بھی قوم اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندگی کی امنگ اور حوصلہ ہو۔ مردہ قومیں کبھی بھی عزت اور آبرو کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکیں اور زندہ قومیں تو اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر بدل ڈالتی ہیں۔

جمشید پور کا فساد، فساد نہیں سیاست تھی۔ اس سیاست نے سینکڑوں کی جانیں لے لیں اور کسی نے اقتدار پر اپنے قدم مضبوط کئے لیکن یہ انسانی جانیں سیاستدانوں کے چولھے کا ایندھن بن گئیں۔ کیا انسانی خون کے بغیر سیاست ممکن نہیں؟ اگر یہ سیاست ہے تو پھر

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

حیوانیت، بہیمیت اور کمینہ پن کس چیز کا نام ہے؟ ہمارے سیاستداں، رہنما، حکمراں کب تک خون کے سوداگر بنے رہیں گے؟

۲۹ اپریل ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے قتل کرنے کب آ رہے ہو؟

جمشید پور میں جو کچھ ہوا وہ وقت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس فساد نے گذشتہ ۳۲ سالوں کے دوران ہونے والے تمام فسادات کے رکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فساد نے ہمارے سیکولر کردار کی جڑیں تک ہلا ڈالی ہیں۔ اس عظیم ملک کے چہرے پر کالک پوت دی ہے۔ اس کا کردار مسخ کر دیا ہے۔ اسے پوری دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیا ہے۔ کیا اس کے باوجود دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم ایک مہذب سماج میں رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات اس ملک کیلئے بہت بڑی لعنت ہیں۔ اسے تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں لیکن ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچنے والا کوئی نہیں ہے۔

اس عظیم ملک میں بہت سارے ادیب شاعر اور دانشور رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قلم کی کوکھ سے انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ ادیب بڑے ہوں یا چھوٹے ایک برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گذشتہ ایک سال کے دوران کئی خونیں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے لیکن کسی بھی ادیب نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کسی نے ان فسادات کی مذمت نہیں کی۔ کسی نے بھی ظالموں کو لعن طعن نہیں کی اور ان کی سرکوبی کے لئے آواز بلند نہیں کی۔ اور فرقہ وارانہ فسادات کو تو چھوڑیئے لیکن جمشید پور میں تو سینکڑوں افراد کا خون ناحق ہوا اور اس میں ہماری

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

برادری کا ایک فرد زکی انور بھی شامل ہے۔ آخر ان کا جرم کیا تھا؟ ایک جانب تو ہمارے ملک کے ادیب اور دانشور اتنے روادار ہیں کہ چین و ویتنام میں جنگ ہوئی ہے تو ان کے منہ سے چیخیں نکل پڑتی ہیں۔ روس میں ادیبوں پر مظالم ہوں تو ان کی جانب سے مذمت کی جاتی ہے۔ اور جنگ مغرب میں چھڑے یا مشرق میں ان کے ذریعہ مذمت کی تجویز پاس کی جاتی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ اپنے ملک میں اتنا بڑا مقتل بن گیا لیکن کسی نے تعزیتی تجویز پاس نہیں کی۔ اپنی برادری کے ایک فرد کے لئے چند کلمات نہیں کہے جس نے سیکولرزم کیلئے جان دیدی۔ اس کا سارا اثاثہ لوٹ لیا گیا۔ گاڑھی پسینہ کی کمائی سے بنایا گیا مکان جلا دیا گیا اور اس کے بال بچے بے یار و مددگار ہو گئے لیکن کسی نے حکومت سے درخواست نہیں کی کہ زکی انور کے پسماندگان کو حکومت پچاس ہزار روپے دے ــــــ آخر ایسا کیوں ہوا۔ کیا ہمارے بڑے ادیب صرف روس اور امریکہ کے ادیبوں کی ہی خوشامد و تعریف کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں انھیں اپنے ملک کے حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے؟ وہ جس ماحول و معاشرے میں رہتے ہیں اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں ہے۔

جمشید پور میں جو رقصِ ابلیس ہوا اس نے اقلیتوں کو بے حد فکر مند کر دیا ہے۔ وہ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ کچھ فسطائی طاقتوں نے ملک کا مستقبل تاریک کر دیا ہے۔ ہمارے ادیب و دانشور اس تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر آسکتے ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ وہ حالات سے روگردانی کر رہے ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کو سدھارنا نہیں چاہتے اور اپنے فرض سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ جس ملک کے ادیب و دانشوروں کا رویہ ایسا ہو وہ ملک کس راستے پر جا سکتا ہے؟

ہندوستان میں کمزور طبقوں پر آئے دن مظالم ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن آج میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ادیب و شاعر

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

دو دانشوران حالات سے روگردانی کیوں کر رہے ہیں۔ کیا ایسا کر کے وہ حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرتے ہیں۔ کیا یہ حالات سے روگردانی نہیں ہیں؟ آج زکی انور جس وحشت و بربریت کا نشانہ بنے ہیں کل کوئی دوسرا بن سکتا ہے۔ آج ایک گھر ویران ہوا ہے کل دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں بھی اقلیتی طبقہ کا ایک فرد ہوں۔ میں خود کو ادیبوں کی برادری کا ایک معمولی فرد سمجھتا ہوں۔ میں اس رشتہ سے تمام ادیبوں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس وحشت و بربریت کے خلاف خاموش تماشائی کیوں بنے ہوئے ہیں؟ انھوں نے اب تک اپنے قلم کو جنبش کیوں نہیں دی۔ کیا یہ لرزہ خیز مظالم بھی ان کے قلم کو حرکت میں نہیں لا پاتے ہیں۔ نفرت بغض و عناد کی یہ جو اونچی اونچی دیواریں اٹھائی جا رہی ہیں اگر آج انھیں ڈھایا نہیں گیا تو کل ان کے اندر محصور ہو کر ہر ذی شعور کا دم گھٹ جائے گا۔ کوئی اس زہریلے ماحول میں سانس تک نہیں لے سکے گا۔ آج اس زہر کو ختم نہیں کیا گیا تو کل پھیل کر یہ ہر ذی ہوش کو ختم کر دے گا۔

کوئی بھی مذہب قتل و غارت گری کی تعلیم نہیں دیتا ہے۔ وحشت و بربریت نہیں سکھاتا ہے۔ ہم خود کو سب سے زیادہ مذہب پرست کہتے ہیں لیکن سب سے زیادہ وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی وحشت و بربریت کی تو آج کے مہذب معاشرے میں مثال نہیں مل سکتی ہے۔

ہندوستانی معاشرے کی بنیاد سیکولرزم اور سماجی مساوات پر رکھی گئی تھی۔ لیکن آج ان آدرشوں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کیا ہندوستان میں مسلمان رہ کر جینا کوئی جرم ہے؟

یہ بہت اہم سوال ہے۔ آج بہت سے ذہنوں میں اس سوال نے طوفان برپا کر رکھا ہے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ادیبوں کے سر پہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر فرقہ پرستی کے شعلوں میں گھرے ملک کو بچانے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ روایات اور اعلیٰ قدریں جل کر راکھ ہو جائیں گے جن کے ہم امین ہیں اور ہمارے پرکھوں نے ان کی حفاظت ہزاروں سال تک کی ہے۔ ان شعلوں میں صرف مسلمان نہیں جلیں گے ان میں صرف اسلامی تہذیب و ثقافت ہی جل کر راکھ نہیں ہوگی بلکہ فرقہ پرستی کے ان شعلوں میں میر و غالب اور اقبال کے ساتھ ملک محمد جائسی، رحیم رس جان بھی جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ راگوں کے سر تال بھی مر جائیں گے۔ تاج محل، قطب مینار اور لال قلعہ کو بھی شعلوں کی زبان چاٹ جائے گی۔ اور اس ملک کی شکل بالکل مسخ ہو جائیگی۔

آپ، اس ملک کو بچانا چاہتے ہیں تو فرقہ پرستی کی آگ پر پانی ڈالیے۔ آپ علیگڈھ اور جمشید پور جائیے۔

آج ہر ہندوستانی مسلمان کی آنکھوں سے یہ سوال جھانک رہا ہے کہ کیا ہندوستان میں مسلمان بن کر جینا کوئی جرم ہے؟

میرے ذہن میں بھی یہ سوال ہے۔ میں بھی یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

میں اپنے برادری کے بزرگوں اور دوستوں سے یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں

میں یہ سوال گوپال متل، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

میں یہ سوال اوپندر ناتھ اشک، کشمیری لال ذاکر، جوگندر پال، رام لعل اور وشوا ناتھ طاؤس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

میں اپنے تمام غیر مسلم دوستوں سے یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

—— اگر میرا مسلمان رہ کر جینا کوئی جرم ہے تو آپ مجھے اس جرم کی سزا کب دیں گے؟

—— آپ مجھے قتل کرنے کے لئے کب آ رہے ہیں کہ میں گھر پر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا——!

۱۳ مئی ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ سوچ رہے ہیں کہ کہاں آ گئے ہم لوگ

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ ملک آخر کس طرح چل رہا ہے۔ کوئی اسے چلا بھی رہا ہے یا بس یوں ہی چلے جا رہا ہے اور کب تک یوں ہی چلتا جائے گا۔ کیوں کہ جس طور پر انتشاری کیفیت چل رہی ہے وہ ملک کے لئے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ وطن دوست اور قوم پرست اس کے بارے میں کچھ سوچتے ہوں اور اس پر غور کرتے ہوں لیکن چند اصحاب کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اتنا بڑا ملک ہے اس میں مختلف مذاہب رنگ و نسل کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان، تہذیب و ثقافت بھی ہے۔ انھیں ایک دھاگے میں پرونا اور ان میں قوم پرستی کے جذبات پیدا کرنا اس ملک کی یک جہتی کیلئے کس قدر ضروری ہے لیکن اس پر زور نہیں دیا جا رہا ہے۔ یہ بڑے ہی افسوس کا مقام ہے کہ ہر شخص بے لگام ہو کر بھاگا جا رہا ہے ہر فرد بے سمتی کا شکار ہے۔ جنتا حکومت نے اب تک عوام کو بے روح آزادی کے سوا کچھ نہیں دیا ہے اور اس سے زیادہ شائد کچھ دے بھی نہ سکے لیکن روٹی کپڑا اور بنیادی ضرورتوں کے بغیر آزادی بے معنی ہے یہ کسی وقت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

شری جے پرکاش نرائن نے ملک کو دوسری آزادی دلائی لیکن وہ اس کے بعد ملک کے حالات سے لاتعلق ہو گئے۔ وہ مسلسل ڈائلاسس پر چل رہے ہیں۔ وہی کیا پورا ملک ہی ڈائلاسس پر چل رہا ہے لیکن اس طرح کب تک چلتا رہے گا۔ کیوں کہ ملک کے جسم سے توانائی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بے روح آزادی جسم کو توانا نہیں بنا سکتی۔

آج سماج کا کون سا شعبہ ہے جو انتشار سے دوچار نہیں ہے۔ کون سا طبقہ ہے جو غیر مطمئن نہیں ہے ـــــ فرقہ وارانہ فسادات تو خیر اس ملک کی قسمت میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ پہلے بھی فسادات ہوتے تھے۔ آج بھی ہو رہے ہیں فرق صرف یہ آیا ہے کہ اب حکومت مظلوموں کی دادرسی کرنے کے بجائے الزام انھیں کے سر منڈھ دیتی ہے۔ بے اطمینانی کی یہ کیفیت عوام کا اعتماد متزلزل کر رہی ہے۔

یہ حالات عوام کو تعمیر کے بجائے تخریب کی جانب لے جا رہے ہیں جب ہر طرف تخریب ہی کی بالادستی ہو تو عوام کے ذہن کو تعمیر کی جانب موڑا بھی کیوں کر جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے فرض سے تجاہل برت رہا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ آج کل پورے ملک میں پولیس کی تحریک چل رہی ہے یہ تحریک کس لئے ہے کہ تنخواہوں میں الاؤنس اور ملنے والی رعایات میں اضافہ کیا جائے یہ تحریک پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ پولس کا کام ہے؟ عوام کی حفاظت کرنا، جان، مال، عزت آبرو کو تحفظ دینا، ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ایک معزز پیشہ ہے لیکن اگر اس عہدہ پر رہ کر کوئی اپنی ذمہ داری سے تجاہل برتتا ہے تو عوام کی حالت کیا ہوگی وہی نا جو ابھی ہو رہی ہے؟ عوام خود کو ہر لمحہ غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ ہر شخص میں عدم تحفظ کا احساس ہے کیوں کہ پولیس نے اپنی ذمہ داریاں نبھانی بند کر دیں۔

پولس بھی کیا کرے۔ انھیں اتنی تنخواہ نہیں ملتی کہ ان کا خرچ پورا ہو سکے تو وہ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ اوپر کی آمدنی کرنا شروع کر دیں۔ ایسا کرتے ہیں تو معاشرے میں گندگی پھیلتی ہے اور وہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ پولیس کے لئے محض وردی ہی کافی نہیں ہے وردی کے نیچے پیٹ ہوتا ہے اور پیٹ کھانا مانگتا ہے۔

دوسرے شعبوں کے ملازمین بھی آئے دن مانگوں کو لے کر تحریکیں چلاتے رہتے

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہیں۔ ریلوے ملازمین بونس چاہتے ہیں ان کے اور بھی مطالبات ہیں۔ ان مطالبات کو لیکر وہ بھی ایجی ٹیشن کر رہے ہیں۔ لیکن موجودہ حکومت کیلئے ان سارے مطالبات کو یکسر رد کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس وقت وزارت میں کئی ایسے افراد بھی ہیں۔ جن کی لیڈری انھیں مطالبات کو لے کر چلتی رہی ہے وہ سابقہ حکومت سے یہ مطالبات منوانے کیلئے تحریکیں چلاتے تھے۔ آج یہ مطالبات ان کے لئے حلق کی ہڈی بن کر رہ گئے ہیں۔

اگر ریلوے ملازمین کو بونس دیا جائے تو مرکزی حکومت کے دوسرے ملازمین بھی ایسا ہی مطالبہ کر سکتے ہیں اور ان مطالبات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ مطالبات پورے کئے جائیں واخراجات میں اضافہ ہوگا اور اخراجات پورے کرنے کیلئے مزید ٹیکس لگانے پڑیں گے۔ ٹیکسوں کی زیادتی سے عوام کی کمر پہلے ہی بری طرح ٹوٹ رہی ہے یہاں تک کہ اب تو تاجران نے بھی ٹیکسوں کے خلاف منظم مہم چلانی شروع کر دی ہے لکھنؤ میں تو حال ہی تشدد کے واقعات بھی پیش آئے اور پورے ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ ٹیکس کم کر دیئے جائیں تو اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔

ہمارے وزیر باتدبیر اپنے اخراجات میں کمی کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ ان کی حیثیت سفید ہاتھی کی سی ہے۔ راجے مہاراجے ختم کر دیئے گئے۔ ان کے پریوی پرس بند کر دیئے گئے لیکن وزیروں کی صورت میں نئے مہاراجے پیدا ہو گئے۔ جنتا حکومت کے وزیروں نے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر سادگی کا حلف لیا تھا لیکن صرف عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے کیوں کہ عملی طور پر سادگی کہیں دیکھنے میں نہیں آتی بلکہ کئی لحاظ سے تو وزیروں کے اخراجات کانگریسی وزیروں کے مقابلے میں کہیں زائد ہیں اور دعویٰ سادگی کا ہے اسے وہ گاندھیائی طرز زندگی کا نام دیتے ہیں۔

جنتا حکومت اتنی جلد عوام کی نظروں سے گر جائے گی اس کی کسی کو توقع نہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تھی۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ کانگریسیوں کو اتنا بڑا دھکا لگا تو ان کے جانشیں کچھ سبق حاصل کریں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کسی نے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ ان کی اس طرز عمل سے عوام میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے ان کی طرز رہائش عوام میں بے اطمینانی پیدا کرتی ہے کیونکہ عیش و عشرت پر عوام کی گاڑھی کمائی ہی صرف ہو رہی ہے۔

آئے دن کے ایجی ٹیشن اس بحرانی کیفیت کا اظہار ہیں جن سے عوام گذر رہے ہیں یہ افسوس کی بات ہے کہ حکومت اس جانب کوئی توجہ نہیں دے رہی ہے۔ عوام کی بے اطمینانی کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے ان کے مسائل حل کرنے سے دلچسپی نہیں لے رہی ہے اگر ان کی صبر کی حد ختم ہو گئی تو یہ بھیانک شکل اختیار کر سکتے ہیں اس کی شاید ہمارے رہبروں کو کوئی فکر نہیں ہے۔

عوام کا اضطراب اور آئے دن کا ایجی ٹیشن ملک کو تخریب کی جانب لے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر شعبہ روبہ زوال ہے کاش کہ ہمارے ارباب اقتدار سوچیں کہ وہ ملک کو کس جانب لے جا رہے ہیں اور ملک کے مستقبل سے کھلواڑ کرنا کیا حب الوطنی ہے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں ملک کی فلاح سے دلچسپی ہے؟ کیا وہ ایسے نازک وقت میں راستے کی نشان دہی نہیں کر سکتے؟

۱۰ر جون ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سچ کہنا اگر بغاوت ہے

۱۹۷۴ء کی مکمل انقلاب کی تحریک کے روح رواں جے پرکاش نرائن نے یہ نعرہ دیا تھا کہ "سچ کہنا اگر بغاوت ہے تو سمجھو ہم بھی باغی ہیں" اور یہ بغاوت اس حکومت کے خلاف تھی جسے ہندستانی عوام نے منتخب کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے افواج اور پولس کو بھی یہ نیک مشورہ دیا کہ وہ احکام ماننے سے انکار کر دیں۔ اسکے بعد جو بدنجتانہ حالات پیش آئے ان سے ہم سبھی واقف ہیں اور انھیں دہرا کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے ہماری افواج ہمیشہ سے ہی ڈسپلن کی پابند رہی ہیں اس لئے انھوں نے اس نعرہ کا کوئی اثر نہیں لیا۔ پولس نے بھی اس وقت کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

۱۹۷۷ء میں جے پی کے مکمل انقلاب کے بطن سے جنتا حکومت کا جنم ہوا اور اس کے بعد سے ملک میں جو حالات رونما ہوئے ہیں ان سے بھی ہم بخوبی واقف ہیں اور اب یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ پولس نے بغاوت کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ جو دوسروں کیلئے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔ انھوں نے یہ نعرہ تو ۱۹۷۴ء میں دیا تھا لیکن پولس کے جیالے جوان اس کی تعمیل اس وقت ۱۹۷۹ء میں کر رہے ہیں جب کہ مکمل انقلاب کے ذریعہ پیدا کردہ حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمام صوبوں میں پولس نے بغاوت کی راہ کیوں اختیار کی؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ پولس کی وردی کے نیچے اس کا پیٹ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھی ہوتا ہے جو بھوک کا نعرہ لگاتا رہتا ہے۔ پولس جوانوں کی تنخواہیں کم ہیں۔ ضروریات زندگی مہنگی سے مہنگی ہوتی جا رہی ہیں لیکن ان کی تنخواہ میں کسی طرح کا کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے جنتا حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد سے اشیاء کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے شعبوں کے ملازمین کی تنخواہ اور ٹی۔اے، ڈی۔اے میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وزراء سفید ہاتھی ثابت ہو رہے ہیں اور ان کی حفاظت کرنیوالے پولیس کے یہ جوان تمام اشیاء سے محروم ہیں۔ وہ قریب سے وزراء اور افسران کی شاہانہ زندگی دیکھتے ہیں اور ان کے اندر باغیانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ حالات رونما ہوتے ہیں۔

اس بات سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا کہ جنتا حکومت کے رویہ نے عوام کو اس سے بہت زیادہ برگشتہ کر دیا ہے۔ ان کی ہر محاذ پر ناکامی عوام کے لئے دل تسکنی کا باعث ہو رہی ہے۔ عوام نے حکومت کو وقت بھی دیا اور انتظار بھی کیا لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

مایوسیوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اب عوامی زندگی درہم برہم ہوتی جا رہی ہے اور نراج کی شکل پیدا ہو رہی ہے۔ فورس کے اندر گروپ بازی، سیاست اور یونین بازی اس سے قبل کبھی نہیں تھی۔ اب فورس نے بھی اپنی یونین بنالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ سیاست ان میں داخل ہو گئی جو دھڑے بندی اور گروپ بندی پیدا کرے گی۔ آپس میں ٹکراؤ ہوگا جس کے نتیجے میں بکھراؤ کی شکل سامنے آئے گی۔ پتہ نہیں حکومت ان حالات سے کس طور پر نپٹے گی۔ فی الوقت تو ان کی مانگوں کے سامنے سرنگوں ہو کر صرف تنخواہوں میں اضافے کئے جا رہے ہیں لیکن انسان کی ضروریات تو لامحدود ہیں ان کا ٹھہراؤ کہیں پر نہیں ہے ہر بار حکومت کے لئے بھی جھکنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ کیوں کہ ایسا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اپنے آپ کو مجبور و بے بس سمجھ لے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

اب لے دے کر صرف فوج باقی رہ جاتی ہے جس پر ابتک پورے ملک کو مکمل اعتماد ہے کیوں کہ ہماری افواج کے کارنامے بہت نمایاں رہے ہیں لیکن حال میں وزیر اعظم کی پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندے نے یہ سوال اٹھایا کہ وزیر اعظم کو فیلڈ مارشل جنرل مانک شاہ نے خط لکھا ہے کہ ملک کے افسوسناک حالات کے باعث فوجوں میں بھی مزاج پھیل رہا ہے۔ وزیر اعظم نے اس کی تردید کی۔ خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہی ہو کیونکہ اگر ایسا ہوا تو ملک بربادی کے راستے پر چل پڑے گا۔ ویسے ابھی بوکارو میں انڈسٹریل سیکوریٹی فورس اور بی۔ ایس۔ ایف کے درمیان تصادم اور دہلی میں اس قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں وہ افسوسناک حالات کا پیش خیمہ ہیں ان واقعات سے ہر ذی ہوش کو تشویش ہے کیوں کہ اس قسم کے تصادم ملک کی بنیادوں کو کمزور کرتے ہیں۔

ملک کی سالمیت اور امن و امان کے سلسلہ میں حکومت کو سخت رویہ اختیار کرنا چاہئے اور ان واقعات سے سختی سے نپٹا جانا چاہئے جنتا حکومت بننے کے بعد سے ہر شخص یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس نے مکمل انقلاب برپا کر کے مکمل آزادی حاصل کر لی ہے جس کے معنی بے نکیل اور بے لگام ہو جانا ہے۔

ہمارے رہنماؤں کو ملک کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چاہئے۔ محض کسی شخص یا پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دینا مکمل انقلاب نہیں ہے کیوں کہ اس سے عوام کو خاص فائدہ نہیں پہونچتا چند افراد کو پہونچتا ہے جو غریب عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ یہی طبقہ ہر حکومت کے زمانے میں سرخرو ہوتا ہے اور اقتدار اعلیٰ کو اپنی مٹھی میں بند رکھتا ہے جب تک اس سے نجات حاصل نہ کی جائے مکمل انقلاب کا تصور ہی فضول ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جنتا پارٹی کے عناصر نے محض مکمل انقلاب کے نعرے لگائے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے ہیں کہ مکمل انقلاب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے اور

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انقلاب سب سے پہلے ذہنوں میں پیدا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تو پورا معاشرہ ذہنی طور پر مفلوج کرپٹ اور بے ایمان ہو چکا ہے۔ ان دو برسوں میں اصلاح کے بجائے زوال کا عمل جاری رہا اور مزید گراوٹ آتی گئی ایسی صورت میں اگر پولس نے نافرمانیاں کیں اور انارکی کی حالت پیدا کر دی تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ اگر ان رہنماؤں نے نوشتۂ دیوار نہیں پڑھا اور حقیقت سے روگردانی کرتے رہے تو اس سے بدتر حالات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ آج بھی ان لوگوں کو ہوش آجائے تو سمجھئے کہ ابھی کچھ بھی بگڑا نہیں ہے۔ حالات بدل سکتے ہیں اور اصلاح ممکن ہے۔

۸ر جولائی ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

مجھے بولنے دو

میں اس ہفتہ ایک اہم ضروری اور جلتے سلگتے ہوئے موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لکھنؤ کے چند ترقی پسندوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشست بلا کر "عظیم آباد اکسپریس" اور اس کے مدیر کی مذمت کی متفقہ طور پر تجویز پاس کی اور عظیم آباد اکسپریس کی حق پسند آواز کو بند کرنے کیلئے باہم مشورے کئے ——— اس لئے اب میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس زبان بندی کی مذمت کروں، اس کی مخالفت کروں، اس سنسر شپ کی دھجیاں بکھیر دوں، اس کے پرخچے اڑاؤں اور اس کی خلاف ورزی کروں۔

بات یوں ہے کہ ۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں ابو محمد شبلی کا ایک مضمون "منشی پریم چند عصری آگہی کے آئینے میں" شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں منشی پریم چند کے فن یا ان کی ادبی خدمات سے بحث نہیں کی گئی بلکہ مقصد ڈاکٹر قمر رئیس کے ذریعہ پھیلائی گئی ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ پریم چند انسان تھے کوئی فرشتہ نہیں تھے۔ اس وقت کے جس زہریلے ماحول میں وہ سانسیں لے رہے تھے اس کے دھارے میں دور تک بہتے چلے گئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسا کسی اندازے کی بنا پر نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں۔ لیکن ترقی پسند یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہی حرف آخر ہے۔ ان پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ وہ جس کی چاہیں مذمت کریں لیکن ان پر کوئی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

انگلی نہ اٹھائے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے قبلہ و کعبہ روس میں لوگوں کو اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں ہے اور ضمیر کی آواز پر بولنے والوں کی سزا یا تو دار ہے یا مشقت کیمپ جہاں انسان خون تھوکتا ہوا مر جاتا ہے۔

میں ذاتی طور پر پریم چند کو بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ بہت بڑا افسانہ نگار اور ناول نگار مانتا ہوں، اردو افسانے کا پیش رو سمجھتا ہوں لیکن انھیں فرشتہ نہیں انسان ہی سمجھتا ہوں جن سے کئی فاش غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔

اس مضمون پر ترقی پسند صرف اس لئے بوکھلا گئے کہ جب بھی کسی اردو ادیب و شاعر کی صدی آتی ہے یہ اس کی کمیٹی میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنا الو سیدھا کر سکیں۔ اس لئے یہ ہر ادیب و شاعر کو ترقی پسند ثابت کرتے ہیں۔ غالب صدی آئی تو سارے ترقی پسندوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ غالب ترقی پسند ہو گئے امیر خسرو ترقی پسند ہو گئے اور حد تو یہ ہے کہ اقبال جن پر ترقی پسند اسلامی جنونی ہونے کا الزام لگاتے تھے جن کے بارے میں کہتے تھے

پہن کر مغربی داناؤں کی سر پر بڑی ٹوپی :: نیا ملا سناتا ہے پرانا داستاں ساقی

وہ بھی ترقی پسند بن گئے۔ کیونکہ اقبال صدی میں اس سے مالی فائدے ہونیوالے تھے۔ اقبال کے بارے میں اگر کسی نے حقیقت پسندی کا اظہار کیا تو فراق یا جوش اور کلیم الدین احمد نے۔ کیونکہ انھیں کمیٹی کارکن بننے یا روپے بنانے کی فکر نہیں ستا رہی تھی۔ اب یہی صورت منشی پریم چند کے ساتھ ہے اور عظیم آباد اکسپریس پر اتارا جا رہا ہے کہ یہ اخبار ترقی پسندوں کی کردار کشی کرنے میں خاصا بدنام ہو چکا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس اخبار نے ہی ترقی پسند مصنفین کی خبریں شائع کیں جب کہ اسی باعث ہمارے کئی دوست خفا ہو گئے لیکن ہم اظہار کی آزادی میں یقین کرتے ہیں اس لئے ہم نے ایسا کیا۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نام نہاد ترقی پسند دراصل بدترین قسم کے رجعت پسند اور موقع پرست ہیں۔ انھیں عظیم آباد اکسپریس کی حق گوئی ناگوار گذرتی ہے اور اسے یہ فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں لیکن کیا انھوں نے کبھی ان ہندی اردو اور انگریزی اخبارات کے خلاف آواز اٹھائی جو برابر ہندوستانی مسلمانوں کی کردار کشی کرتے ہیں اسلام پر حملے کرتے ہیں پیغمبران اور بزرگان دین کی شان میں توہین آمیز تحریریں شائع کرتے ہیں؟ ان کے پیٹ میں ویت نام اور افریقہ کے لوگوں کے لئے درد اٹھتا ہے۔ لیکن کیا انھوں نے اپنے ہی جیسے ادیبوں کے لئے آواز اٹھائی جن کو روس کے مشقت کیمپوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ جن پر سائبیریا میں لرزہ خیز مظالم ہو رہے ہیں۔ جن پر زمین تنگ کر دی گئی ہے۔ جن سے انسانی حقوق چھین لئے گئے ہیں۔ اور کتنوں کو تو جلاوطن ہونا پڑا ہے لیکن اس پر ان بے غیرت لوگوں کی زبان بالکل گنگ ہو جاتی ہے۔ بس نزلہ بر عضو ضعیف ایک چھوٹے اردو اخبار کی یہ ضرور مذمت کر سکتے ہیں جس نے اپنا ضمیر اور قلم فروخت نہیں کیا۔ جو ضمیر کی آزادی کیلئے لڑ رہا ہے جس نے ہمیشہ حق و صداقت کی آواز بلند کی ہے اور کر رہا ہے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ یہ ترقی پسند جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق ہے۔ بدترین قسم کے فرقہ پرست ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی معاشی زندگی میں فرقہ پرستی کا زہر گھولا ہے۔ تاریخ شاہد ہے ——— کیا یہی ترقی پسند نہیں تھے جنہوں نے اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا شوشہ چھوڑا کیا یہی ترقی پسند آج تک اس کی وکالت نہیں کر رہے ہیں؟ یہ راہی معصوم رضا، عصمت چغتائی کیا ہیں؟ کیا یہی ترقی پسند نہیں تھے جنہوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا کردار ختم کروایا۔ نورالحسن کیا ہیں؟ انھوں نے ہی علی گڈھ یونیورسٹی کے احاطہ میں واقع مسجد کو اس کا دفتر بنانے کا مشورہ دیا۔ کیا یہی ترقی پسند نہیں ہیں جنہوں نے حال میں مسلمانوں کے فرقہ داؤدی بوہرہ کے مذہبی رہنما

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

روحانی پیشوا داعی مطلق جن کو سارے عالم اسلام میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، کیخلاف شرمناک تحریک چلائی اور چلا رہے ہیں۔ اور کیا یہی نام نہاد ترقی پسند اور کمیونسٹ نہیں تھے جنہوں نے بہار کے پہلے مسلم وزیر اعلیٰ عبد الغفور کے خلاف بزدلانہ تحریک چلائی تھی؟ جی ہاں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جے پی سے بہت قبل عبد الغفور کو ہٹانے کیلئے کمیونسٹ پارٹی نے شرمناک تحریک شروع کر رکھی تھی کہ ہندو اکثریت کے ایک صوبے میں مسلمان وزیر اعلیٰ کیوں ہو۔ جے پی کی تحریک تو بہت بعد کی چیز ہے اور انھیں لوگوں نے جے پی کے خلاف جب جلوس نکالا تو ان کے خلاف شرمناک نعرے لگائے اس میں ایک نعرہ یہ بھی تھا۔ امریکہ کو بھیجو تار۔ جے پر کاش کی ہو گئی ہار، ان کے اس رویہ پر عظیم آباد اکسپریس نے ایک سخت اداریہ بھی لکھا تھا۔

لیکن جب پارٹی اقتدار میں آگئی تو یہی لوگ جے پی کے آگے پیچھے کرنے لگے، جے پی کے ساتھ تصویریں اتروا کر شان سے اخبار و رسائل میں چھپواتے تھے۔ جب تک اندرا گاندھی رہیں ان کی کاسہ لیسی کی۔ جنتا پارٹی کا اقتدار آیا تو جے پی کی خوشامد شروع کر دی گئی۔ یہ ان لوگوں کا کردار ہے۔ کئی ترقی پسند تو نیکر پہن کر ناگپور کے چکر لگاتے بھی نظر آئے۔

ذاتی مفاد کے لئے یہ کمیٹیوں میں گھسیں، اکادمیوں پر قبضہ کر لیں۔ اپنی بری بھلی کتابوں پر انعامات لے لیں کون منع کرتا ہے؟ لیکن تاریخی حقیقتوں کو کیوں جھٹلاتے ہیں اور ان کے جھٹلانے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ کتابوں میں چھپی ہوئی تحریریں پتھر کی لکیر ہیں انھیں بدلا نہیں جا سکتا۔ عہدوں اور انعامات کے یہ لالچی اگر ان کا بس چلے تو ناتھورام گوڈسے، گورو گولوالکر، بالا صاحب دیورس اور بلراج مدھوک کو بھی ترقی پسند کہہ کر ان کی تقریبات کمیٹی بنا لیں اور پیسے کمائیں انھیں روکا کس نے ہے؟ لیکن یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ یہ روس نہیں ہندوستان ہے جہاں جمہوریت ہے اور لوگوں کو اظہار و خیال کی آزادی دی گئی ہے۔ اس کے لئے لوگوں نے بہت قربانیاں بھی دی ہیں۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان کو پاکستانی کہہ کر پکارا جائے یا پاکستان کا ہوا دکھایا جائے تو وہ دبک جائے گا۔ یہ ایک بدترین اور قابل مذمت حربہ ہے لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ ان کے سالار کارواں سجاد ظہیر وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ کیوں گئے تھے؟ اور یہ ترقی پسند آخر روس کے ہی کیوں گن گاتے ہیں۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

یہ رہتے ہندوستان میں ہیں، کھاتے پیتے اور سانس یہاں لیتے ہیں اور کلمہ روس کا پڑھتے ہیں۔ انھیں گاندھی ازم پسند نہیں مارکس ازم یا لینن ازم کا ورد کرتے رہتے ہیں تو وفاداری ان کی مشکوک ہے یا ہندوستانی مسلمان کی؟ اسلام نے تو وطن سے وفاداری کو شرط اول قرار دیا ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے: مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یہ شعر کسی ترقی پسند نے نہیں کہا ہے۔ یہ شعر غالب کا ہے۔ ہندوستان کے لوگوں میں رواداری شروع سے رہی ہے۔ فرقہ پرستی کا زہر تو انھیں ترقی پسندوں نے گھولا ہے۔ رحیم خاں خاناں نے کرشن بھکتی کے گیت کیوں لکھے؟ رس خان کرشن جی کے عشق میں کیوں دیوانے ہوئے؟ چھنو لال دلگیر نعت گو کیوں بنے؟ اور تو چھوڑ دیجئے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھنے والے میاں میر کیا مسلمان نہیں تھے؟ اگر گرو گوبند سنگھ جی کے لڑکوں کو موت کے گھاٹ اورنگ زیب کے حکم سے اتارا گیا تو کیا اس کے خلاف سخت احتجاج کرنے والے راجہ آف مالیر کوٹلہ مسلمان نہیں تھے۔ بغاوت اور تحریک آزادی کے زمانے میں ہندو مسلم رواداری اور دوستی کے مناظر کیا لوگوں نے نہیں دیکھے۔ کیا مہاراجہ بھوپندر کمار آف پٹیالہ نے مسلمانوں کے لئے مسجد نہیں بنوائی تھی۔ اس طرح کی ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں ہیں جو ہماری تاریخ کے روشن باب ہیں۔ ایسا اس لئے تھا کہ انھیں ہندوستان سے پیار تھا۔ وہ خود کو ہندوستانی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ان کی اپنی سرزمین کو ہی چاند ستارے اور سورج جھک کر سلام کرتے ہیں ان کی وفاداری کسی دوسرے ملک اور کسی دوسری سرزمین سے نہیں تھی۔

عظیم آباد اکسپریس کے خلاف لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کی بابت میں کیا کہوں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہندی اردو ادیبوں کا ایک ساتھ بیٹھنا خواب و خیال ہو جائے گا۔ اس نشست کی صدارت جناب رام لعل نے کی تھی۔ رام لعل صاحب نے ۱۹۶۹ء میں خود مجھے لکھا کہ کرشن چندر اپنے ترقی پسند دوستوں کو اردو کے لئے دوسری سرکاری زبان بنانے پر راضی نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں ملک راج آنند اور بھگوتی چرن ورما کا نام خاص طور پر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھگوتی چرن ورما، یشپال امرت لال ناگر، امرت رائے، دھرمویر بھارتی، سمتر انندن پنت وغیرہ سبھی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا یا علاقائی زبان کا درجہ دیئے جانے کی مخالفت کی تھی اور کھل کر کی تھی۔ اور یہ تو ابھی بالکل حال کی بات ہے کہ میں جولائی ۷۹ء کے مہینے میں لکھنؤ میں تھا۔ میری بدقسمتی کہ میں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں چلا گیا۔ جس کی صدارت ہندی کے مشہور ترقی پسند ادیب اور جنتا ممبر راجیہ سبھا شری امرت لال ناگر کر رہے تھے۔ اس میں عابد سہیل صاحب نے ایک مقالہ پڑھا اور اس کے بعد نشست کی شکل سیاسی ہو گئی۔ اس میں ایک قرارداد پیش کی گئی کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کو روکا جائے۔ امن و قانون کی حالت درست کی جائے اور ہریجنوں پر ہونے والے مظالم کو روکا جائے۔ تو میرے بازو بیٹھے ہوئے یوپی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری اور معلم اردو کے ایڈیٹر جناب عباس اردو لوی نے ایک ترمیم پیش کی ہندوستانی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور کروڑوں افراد کی زبان اردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کا بھی ذکر اس تجویز میں کیا جائے تو سارے ترقی پسند مصنفین اس کی مخالفت کرنے لگے حالاں کہ اس نشست میں سوائے امرت لال ناگر کے سارے ادیب اردو کے ہی تھے۔

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بالآخر یہ کہا گیا کہ یہ تجویز چیئر سے پیش کی گئی ہے اس لئے اس میں ترمیم ممکن نہیں۔ یعنی محض ایک ہندی ادیب کی خوشنودی کے لئے تمام اردو ادیبوں نے اپنی زبان کے مفاد کی قربانی دے دی۔ اب بتلایئے کیا ترقی پسند ہندی ادیبوں کے ساتھ برابری کی سطح پر بیٹھنا چاہتے ہیں یا صرف ان کی کاسہ لیسی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اردو کے ادیب خود کو صرف اس لئے کمتر سمجھیں کہ وہ اردو کے ادیب ہیں۔ ان لوگوں نے تو وہاں یہی تاثر دیا ان لوگوں کا یہی رویہ رہا تو ہندی اردو ادیبوں کی بات تو دور رہی نئے اور پرانے اردو ادیبوں کا ساتھ بیٹھنا خواب و خیال ہو جائے گا۔ کیوں کہ نئے ادیب اپنا ضمیر بیچنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں میں رام لعل صاحب کے بارے میں کیا کہوں ـــــ ۱۹۷۶ء کی بات ہے میں لکھنؤ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ یوپی اردو اکادمی نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعہ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" پر فحاشی کا الزام لگا کر اسے انعام سے محروم کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس شرمناک اور دلآزار اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یوپی اردو اکادمی سے مستعفی ہونے جا رہے ہیں اور فحاشی پر ایک سیمینار بلائیں گے کہ آخر فحاشی ہے کیا؟ انھوں نے مجھ سے بھی تعاون چاہا۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ میرا ہر قسم کا تعاون ان کے ساتھ ہے۔ میں نے پٹنہ واپس آتے ہی یوپی اردو اکادمی کے خلاف ایک سخت اداریہ لکھا، کس کے ہاتھ قلم ہوئے؟ بیدی کو انعام نہ دیئے جانے پر سخت احتجاج کیا۔ حالانکہ راجندر سنگھ بیدی سے نہ میری آج تک کبھی ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت نہ بات چیت نہ وہ میرے ہم عصر نہ ہم مذہب نہ ہم خیال۔ صرف یہ سوچ کر کہ ہمارے ایک مایہ ناز مصنف پر فحاشی کا بے بنیاد الزام عائد کر کے اسے انعام سے محروم کر دیا گیا۔ اس اداریہ سے یوپی اردو اکادمی میں کھلبلی مچ گئی میرے خلاف جو کچھ کیا گیا میں اس کا ذکر یہاں فضول سمجھتا ہوں۔ جنہوں نے میری آواز میں آواز ملائی ان سب کو بھی بھگتنا پڑا۔ ان میں میرے ایک دوست احمد ابراہیم بھی تھے جنہیں

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن رام لعل نے نہ احتجاجاً استعفےٰ دیا۔ نہ میری آواز میں آواز ملائی۔ نہ
فحاشی پر سیمینار بلایا۔ میں نے انھیں دو تین خط لکھے لیکن انھوں نے جواب تک نہیں دیا۔ آخر
ان کی ترقی پسندی کہاں گئی تھی؟ انھیں سانپ کیوں سونگھ گیا تھا؟ اور ابھی جولائی میں جب
میں لکھنؤ میں تھا۔ تو انھوں نے کہا کہ میں نے یوپی اردو اکادمی سے استعفےٰ دیدیا۔ جب کہ مدت
ختم ہونے میں محض چند دن باقی تھے۔ حالانکہ یہی استعفےٰ انھوں نے بیدی کو انعام نہ دیئے جانے
کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے نہیں دیا تھا۔ اس لئے میں نے اس استعفےٰ پر کوئی توجہ نہیں دی۔

ترقی پسند خود کو غریبوں مظلوموں اور کمزوروں کے دوست بھی کہتے ہیں۔ آپ دہلی
یا بمبئی جائیں تو ان کی کوٹھیاں آپ کو پوش کالونیوں میں مل جائیں گی۔ ان کو کار سے لیکر فرج۔
ٹی وی اور آسائش کی ساری چیزیں حاصل ہیں۔ یہ غریبوں کے غم میں قیمتی شراب کے جام لنڈھاتے
ملیں گے۔ ہندوستان کے آدھے سے زیادہ افراد کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا ہے لیکن غریبوں کے
غم میں آنسو بہانے والے ان ترقی پسندوں کی زندگی کا آپ جاکر مشاہدہ کریں تو خود ہی آپ کو
اندازہ ہو جائے گا۔ ترقی پسند دراصل وہ ہے جسے اپنی ترقی پسند ہو۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ترقی پسندی دراصل ایک
کتا ہے اور وہ بھی کٹکھنا تو آج اس پر ایمان لانا پڑتا ہے ـــــ میں نے تو یہ سطور صرف اسلئے
لکھیں کہ ترقی پسندوں کے ذریعہ اس عاید کردہ سنسر شپ کے خلاف ورزی کروں اور میں
ان باضمیر اہل قلم و صحافیوں سے بھی کہوں گا کہ اس زبان بندی کے خلاف شدید احتجاج کریں
اور حق و صداقت کی آواز بلند کریں۔

چہرے کی سیاہی دھو دیجئے آئینوں پہ غصہ مت کیجئے :: آئینے تو سچ ہی بولیں گے آئینوں کو جھوٹا کون کہے

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہماری آزمائش کیا کروگے اے وطن والو

مرادآباد سے لے دہلی، میرٹھ، علی گڈھ، فیروزآباد، الہ آباد، مہو اور کانپور تک جو رقص ابلیس ہو رہا تھا وہ اب شانت ہو چکا ہے۔ موت اور تباہی کے اس بھیانک رقص نے کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑ دیں۔ کتنی بہنوں کی کلائیاں سونی کر دیں۔ کتنوں کے گھر ویران ہو گئے۔ کتنے مکانوں میں اندھیرا چھا گیا۔ کتنے بسیرے تاریک ہو گئے۔ اسکا حساب کون لگائے گا۔

عید کے دن مرادآباد کی عیدگاہ میں جو کچھ ہوا وہ کسی طرح بھی جلیان والا باغ سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جلیان والا باغ میں ہندو مسلمانوں اور سکھوں نے آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کیں لیکن وہ بھی ایک خوشی کا دن تھا یعنی وہ بھی بیساکھی کے روز جنرل ڈائر نے آزادی کے متوالوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ اس میں جوان بھی تھے بوڑھے بھی اور بچے بھی۔ سب گولی کا نشانہ بنے۔ لیکن مرادآباد میں جو گولی چلی وہاں اس کا ذمہ دار کون تھا؟ وہاں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ ایک معمولی سے واقعے کو لے کر پولس اور پی اے سی نے نمازیوں پر گولیوں کی بوچھار کر دی اور مرادآباد کے مسلمانوں کی عید محرم میں تبدیل ہو گئی۔ گھر ماتم کدے بن گئے ان گھروں کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کرنے والا ہے۔

لیکن آج ہمارا قومی پریس کیا کر رہا ہے اس نے مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بات نہیں کی تو خیر لیکن ہمارے نام نہاد قومی پریس نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کا تہیہ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

کر رکھا ہے شاید قومی پریس یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان کے بارہ کروڑ مسلمان اسی لائق ہیں کہ انھیں مکھی مچھروں کی طرح مار دیا جائے۔

مرادآباد کے مسلمانوں کے زخموں پر سب سے پہلے نمک پاشی کا سلسلہ ٹائمز آف انڈیا نے شروع کیا۔ اس کے نام نہاد سیکولر ایڈیٹر گری لال جین نے پہلے صفحہ پر ایک مضمون لکھا جس میں مرادآباد کے واقعے کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ ان کا الزام تھا کہ مسلمان عیدگاہ میں اسلحے لے کر گئے تھے اس لئے جو کچھ ہوا اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ہے ——— قربان جائیے گری لال جین کے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ مرادآباد کی عیدگاہ میں ڈیڑھ لاکھ کا مجمع تھا۔ نمازی اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیوں کو لے کر گئے تھے گرمی کے موسم میں عام طور پر لوگ کرتا اور پاجامہ پہن کر ہی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ کوئی شخص اسلحہ لے کر نماز پڑھنے نہیں جاتا۔ اگر کوئی سازش ہوتی تو بہرحال لوگ بچے اور بچیوں کو لے کر نہ جاتے کہ اس طرح وہ بھگدڑ میں کچل کر مارے نہ جاتے۔ نماز اور عیدگاہ کی حرمت گری لال جین کو کیا معلوم کہ مسلمان وہاں سازش کرنے نہیں جاتے ہیں نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔ محبوب حقیقی کے دربار میں سربسجود ہونے کے لئے جاتے ہیں جین صاحب نے مسلمانوں کو جو گالی دی ہے اس سے بڑی گالی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ان کو فوری طور پر وہاں غیر ملکی ہاتھ بھی نظر آگیا۔ اس میں پاکستان اور عرب ممالک بھی نظر آگئے۔ لیکن درحقیقت جو ہاتھ وہاں کام کر رہا تھا وہ انھیں نہیں نظر آیا۔

مرادآباد یا دوسرے مقامات کے واقعات سے پاکستان کا کیا تعلق ہے میں نہیں جانتا۔ جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری کہتے ہیں کہ اس واقعے میں پاکستان کا نہیں روس کا ہاتھ ہے وزیر اعظم اندرا گاندھی کہتی ہیں کہ اس میں غیر ملکی ہاتھ ہے لیکن اس سے عرب ممالک کا کوئی

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

تعلق نہیں کیوں کہ ہندوستان کے قدیم زمانے سے عرب ممالک کے ساتھ گہرے مراسم رہے ہیں اور ہیں بعض اشخاص اسطرح کے بیانات سے ہندو عرب تعلقات خراب کروانا چاہتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی غیر ملکی ہاتھ ہے تو حکومت کو اسے بے نقاب کرنا چاہیئے اور اسے کاٹ کر پھینک دینا چاہیئے کہ ہمارے گھر میں کوئی باہر کا ہاتھ اس طرح زہر نہ گھولے کوئی ہماری خوشیوں کو ماتمی جلوس میں تبدیل نہ کرے۔

ہم کو آزاد ہوئے تینتیس سال ہو گئے لیکن ہم نے نہ اپنی روش بدلی اور نہ ذہنیت بڑی آسانی سے مسلمانوں کو پاکستانی یا پاکستانی ایجنٹ کہہ دیا جاتا ہے ہمیں بتایئے کہ آج تک کتنے مسلمان پاکستان کیلئے جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اس سلسلے میں جتنے پکڑے گئے اور جتنوں کا کورٹ مارشل ہوا وہ سب کے سب غیر مسلم تھے؟ پھر آپ یہ گالی ہمیں کیوں دیتے ہیں؟ اس سے بڑی کسی مسلمان کے لئے گالی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ تین دہائیوں سے ہمارے صبر کا امتحان لے رہے ہیں۔ آزادی کے بعد کون سی ایسی گالی ہے جو ہمیں نہیں دی گئی۔ عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ نوکریوں کے دروازے پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ تجارت کے دروازے بند کئے گئے۔ اگر بنیے بھی تو اسے فساد کر کے تہہ و بالا کر دیا گیا۔ کیا آپ جبل پور کو بھول گئے۔ فیروز آباد۔ بنارس۔ جمشید پور اور مسلمانوں کے تجارتی مراکز میں کیا ہوتا رہا۔ ان کے کاروبار برباد کئے جاتے رہے انہیں معاشی طور پر مفلوج کیا جاتا رہا۔ اور آپ ان کے صبر کا امتحان لیتے رہے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے۔ یوپی کی پی اے سی کتنی خونخوار ہے اس کی بدنامی کی داستان کوئی نئی چیز نہیں۔ اس نے تو حکومت کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ کیا لوگ بھول گئے کہ یہی پی اے سی تھی جس نے کملاپتی ترپاٹھی کی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا لیا تھا۔ اس نے علیگڈھ اور میرٹھ اور بنارس میں اپنی خونخواری کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ شاید اسے دہشت گردی کیلئے ہی بنایا گیا۔ اتر پردیش میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

۱۳ فیصد ہے لیکن پی اے سی میں ان کا تناسب کیا ہے۔ دو لاکھ میں تین سو یعنی ایک فیصد کی چوتھائی سے بھی کم (۰.۰۱) پھر یہ پی اے سی اقلیتوں کیلئے خونخوار کیوں نہ بنے۔ جنتا حکومت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کے سامنے جب یہ رکارڈ پیش کیا گیا تو انھوں نے اصولی طور پر پی اے سی میں مزید مسلمانوں کی بھرتی کی بات تسلیم کی تھی کانگریس آئی نے اسے اپنے الیکشن منشور میں رکھا کہ پی اے سی کی تنظیم نو کی جائے اور فسادات سے نپٹنے کیلئے ایک فورس بنائی جائے جس میں تمام فرقے اور طبقوں کو نمائندگی دی جائے لیکن حکومت کے نصف سال گذرنے کے باوجود ابتک کچھ نہیں ہوا۔

مشکل یہ ہے کہ ہم فسادات پر قابو پانے کے بارے میں اس وقت سوچتے ہیں جب کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ ہم اس پر غور نہیں کرتے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں کہ اس قسم کے واقعات رونما ہی نہیں ہو سکیں۔

آزادی کے بعد سے ابتک اس ملک میں بہت سے خونچکاں واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ پہلے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے لیکن مرادآباد میں جو کچھ ہوا وہ فرقہ وارانہ فساد کسی طرح بھی نہیں تھا یہ نہتے اور مظلوم نمازیوں پر پولس ایکشن تھا۔ کھلا ہوا بہیمانہ حملہ تھا اور خود اس نے واقعے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ یعنی ہندو مسلمان نہ لڑنے پر آمادہ ہوں تو انھیں لڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ مرادآباد کا واقعہ بہرحال سیکولر کردار پر بہت بڑا کلنک ہے۔ یہ اکثریت یا حکومت کے امتحان کا وقت نہیں ہے بلکہ ہمارے سیکولرازم کا امتحان ہے کوئی بہت بڑی سازش ملک کے اس کونے سے اس کونے تک آگ لگا کر اس پر پٹرول چھڑک رہی ہے۔ کبھی یہ فتنہ آسام میں سر اٹھاتا ہے کبھی کشمیر میں اور کبھی پورا اتر پردیش جوالا مکھی بن جاتا ہے۔ آیئے ہم سب اس آگ کو بجھانے کی کوشش کریں ورنہ یہ شعلہ پورے ملک کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔ ہمارا کیا ہے ہم تو آگ و خون کے دریا سے گذر گئے۔ ہم زہریلے ماحول میں بھی سانسیں لیتے رہے۔ ہم اگنی پریکشا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سے بھی کامیاب و کامران گذرے۔ ہر امتحان سے گذرے ہر مشکل مرحلے سے گذرے اور ابھی عشق کے پتہ نہیں کتنے امتحان باقی ہیں۔ ابھی آزمائش کے کون سے مرحلے آتے ہیں۔

ہماری آزمائش کیا کروگے اے وطن والو
وطن میں بے وطن ہوں یہ وطن کی آزمائش ہے

۳۱ اگست ۱۹۸۰ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

ہم سب فرقہ پرست ہیں؟

اس برصغیر کو اگر کسی چیز سے سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے تو وہ فرقہ پرستی ہے ہم گذشتہ پچاس برسوں سے فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہے ہیں اور فرقہ پرستی کی یہ آگ جہنم کی آگ کی طرح ہمارے سارے سرمائے کو چاٹتی جا رہی ہے۔ فرقہ پرستی کے اس جہنم کا در کبھی جبل پور میں کھلتا ہے کبھی بنارس میں کبھی کانپور میں کبھی جمشید پور میں اور کبھی مرادآباد میں۔ جہاں جہنم کا یہ در کھلا انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ املاک کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ یہ بچے، بوڑھے، عورت مرد میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ اور سب سے پہلے تو ہماری انسانیت جھلس کر، جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی اور ہم اب تک صرف فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہے ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ ملک کے سارے سرمائے اور وقار کو بھی اس آگ میں جھونک کر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے تینتیس برسوں کے بعد بھی ہم نے اپنے ذہن سے فرقہ پرستی کا زہر ختم نہیں کیا ہے حالانکہ ہمارے اندر تعلیم کا اوسط پہلے کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے اس لحاظ سے روشن خیالی میں بھی اضافہ ہوا ہے لیکن فرقہ پرستی جڑ سے نیست و نابود کیوں نہیں ہوتی۔

عید کے روز مرادآباد میں جو افسوسناک واقعہ ہوا وہ کسی طرح بھی فرقہ وارانہ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

فساد ہرگز ہرگز نہیں تھا کیوں کہ وہاں ہندو مسلمان قطعی دست و گریباں نہیں تھے حالاں کہ کچھ شرارت پسندوں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی سعی کی لیکن ناکام رہے۔ اس بدبختانہ واقعہ کی وجوہات جو بھی ہوں لیکن حکومت اسے آر ایس ایس بھارتیہ جنتا پارٹی یا کسی دوسری پارٹی کے سر ڈال کر عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کی ساری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اگر حکومت خود کو بے دست و پا پاتی ہے تو اسے ذمہ داری سے دستبردار ہو جانا چاہئے اور بہتر ہو کہ وہ حکومت انھیں ہاتھوں میں سونپ دے جنھوں نے اسے بے دست و پا کر رکھا ہے۔

عید کے ایک روز بعد میں ایک ضروری کام سے دہلی جا رہا تھا۔ مرادآباد کے واقعے کی خبر آچکی تھی لیکن تفصیلات ابھی نہیں آئی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے ہم سفر آر ایس ایس کے آل انڈیا جنرل سکریٹری پروفیسر راجندر سنگھ عرف رجو بھیا تھے۔ وہی اخبار پڑھ کر مرادآباد کے واقعے کی تفصیلات بتانے لگے۔ پٹنہ سے لے کر دہلی تک ان کا اٹھارہ گھنٹوں تک کا ساتھ رہا اور ان سے ہندو مسلم معاملات پر بہت کھل کر باتیں ہوئیں۔ اتنی تفصیل سے کبھی کسی راشٹریہ سیوئم سنگھ کے کسی نیتا سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان کے خیالات جان کر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ وہ خود بھی قومی یک جہتی کے بڑی شدت سے حامی تھے۔ حالاں کہ ان کی بہت سی باتوں سے میں نے اتفاق نہیں کیا اور میری بہت سی باتوں سے انھیں اختلاف تھا اس کے باوجود وہ مجھے اس بات کے بارے میں سمجھاتے رہے کہ آر ایس ایس کوئی فرقہ پرست جماعت نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ملک میں استحکام پیدا کرنا ہے ——

میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں کو باتیں کرنے اور شیشے میں اتارنے کا فن آتا ہے۔ انھوں نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ مرادآباد کا یہ واقعہ بہت افسوسناک ہے لیکن ساتھ ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کل کو اسکی ذمہ داری ہمارے اوپر ڈالی جائے گی اور تمام سیاسی پارٹیاں اس آگ میں ہاتھ

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

سینکنے کی کوشش کریں گی۔ اس گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کریں گی۔ اس چیک کو بھنانے کی کوشش کریں گی اور لاشوں کا کمیشن کھانے کی کوشش کریں گی۔

مجھے نہیں معلوم کہ آر ایس ایس یا کسی سیاسی پارٹی کا ہاتھ اس واقعے میں ہے یا نہیں لیکن جب میں ۱۵ اگست کی شام کو دہلی پہونچا اور حسب معمول پرانی دہلی گیا تو پتہ چلا کہ ہر طرف پولس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ کرفیو نافذ ہو چکا ہے۔ اردو بازار، جامع مسجد، ترکمان گیٹ چتلی قبر، بلی ماران کہیں جانا ممکن نہیں ہے۔ رات کا وقت تھا سوچا کہ کسی ہوٹل میں کھانا کھا لیا جائے تو دریا گنج میں ایک سردار جی کا معمولی سا ہوٹل نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس ہوٹل میں کئی داڑھی والے مسلمان بھی کھانا کھا رہے تھے۔ اگر وہاں کوئی فتنہ یا فرقہ وارانہ فساد برپا ہوتا تو یہ داڑھی والے مسلمان ان غیر مسلم ہوٹلوں میں ہرگز ہرگز نظر نہ آتے۔ مراد آباد یا اس کے بعد دہلی، علی گڑھ، الہ آباد، چندوسی، سنبھل، مئو یا تمام مقامات پر جو واقعات ہوئے وہ ہرگز ہرگز فرقہ وارانہ نہیں تھے بلکہ انھیں کچھ مفاد پرستوں نے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ ۱۳ اگست کو مراد آباد کے واقعے کے بعد یوم آزادی ۱۵ اگست کو مسلمانوں نے یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ ظاہر ہے جب لوگ مارے جائیں گے۔ ان کے دل روئیں گے۔ ان کے ارمانوں کا خون ہوگا تو دن کوئی بھی ہو ان کی نظروں میں وہ سیاہ ہی ہوگا۔ اب کتنی ہی عیدیں آئیں لیکن ۱۳ اگست کو جو لوگ عید کے دن مارے گئے ہر عید ان کے ماں باپ بہن بھائیوں کے زخم کو ہرا کرنے کیلئے آئے گی۔ وہ بھلا خوشیاں کیا منا سکتے ہیں تو کیا غم کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹنے پر ہندوستانی مسلمانوں کو رونے تڑپنے اور چلانے کی بھی اجازت نہیں ہے یہ کون سی آزادی ہے یہ کون سی جمہوریت ہے جس کے گھر میں جنازہ پڑا ہو اس سے جشن منانے یا شادیانے بجانے کی توقع فضول ہے۔

عوام کیلئے فرقہ پرستی کتنی ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو کچھ اصحاب کے لئے یہ منافع بخش سودا

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بھی ہے۔ کاروبار بھی ہے اور جب تک کچھ مفاد پرستوں کو اس کاروبار سے منافع ہوتا رہے گا وہ اس خوفناک اور گھناؤنے کاروبار کو بند نہیں ہونے دیں گے۔

ہندوستان کے عام انسان وہ ہندو ہوں یا مسلمان انھیں فرقہ پرستی سے نفرت ہے کیوں کہ اس سے سراسر نقصان ہی ہے۔ فساد ہو تو غریب انسان ہی مارے جاتے ہیں انھیں کی املاک تباہ ہوتی ہیں انھیں کی عزت لوٹی جاتی ہے اور انھیں کو برباد کیا جاتا ہے۔ اور آخر میں انھیں کو سیکولرزم کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سبق انھیں پڑھانے کی ضرورت ہے جن کے ذہنوں میں فرقہ واریت گھسی ہوئی ہے اور جن کیلئے یہ بہت ہی منافع بخش کاروبار ہے۔ بظاہر جو اشخاص زیادہ سیکولر بنتے ہیں ان کے ذہن فرقہ پرستی کی غلاظت سے زیادہ ہی آلودہ ہیں۔ غریب عوام خواہ ہندو ہوں یا مسلمان انھیں ایک تو روزی روٹی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دن رات بال بچوں کا پیٹ پالنے میں وقت صرف کرتے ہیں جو وقت بچتا ہے اس میں فکر فردا کرتے ہیں ان کے پاس اتنا وقت کہاں کہ فرقہ پرستی کے بارے میں سوچیں فرقہ پرستی پھیلائیں اور لوگوں کے ذہن کو پراگندہ کریں۔ ان کے ذہن تو اپنی غربت سے پراگندہ رہتے ہیں اور ان کے نزدیک دنیا میں صرف دو مذاہب ہیں غریب اور امیر اس کے علاوہ وہ کسی دوسرے عنوان سے سوچتے ہی نہیں۔

پھر آخر فرقہ پرست کون ہے۔ اور فرقہ پرستی کی یہ آگ بار بار کیوں بھڑک اٹھتی ہے؟ کوئی نہ کوئی معشوق اس پردہ زنگاری میں ضرور ہوگا: کوئی نہ کوئی مکروہ چہرہ ضرور ہوگا جو اس میں آلودہ ہوگا جو تاریکی کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔ فرقہ پرستی کے سانپ کو کچلنا ہے۔ اسے ختم کرنا ہے تو اس چہرے کی نقاب کشائی ضروری ہے لیکن اس کے لئے چہروں سے زیادہ ذہنوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ فرقہ پرستی کچھ ذہنوں میں چھپی ہوئی ہے اور جب تک انھیں اس گھناؤنے کاروبار سے فائدہ ہو رہا ہے وہ اپنا یہ خوفناک کھیل

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

بند نہیں کریں گے۔ خواہ ملک کی کتنی ہی رسوائی ہو کتنی ہی بدنامی ہو اور کتنا ہی خون خرابہ ہو۔ کیوں کہ ان لوگوں کو صرف اپنے کاروبار سے مطلب ہے۔ پتہ نہیں ان کا یہ شیطانی کاروبار کب بند ہوگا۔

ستمبر ۱۹۸۰ء

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh

میں رضوان احمد کے اداریوں کے [illegible]

عصمت چغتائی

رضوان احمد جو کچھ کہتے ہیں اپنے تلے لفظوں میں کہتے ہیں۔ یہ وصف بہت کم اڈیٹروں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے اداریوں کا دوسرا وصف ان کا اخلاص ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، ان کی ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ مصلحت ان کے قلم کو روک نہیں سکتی۔

گوپال متّل

ادھر چند برسوں میں اردو صحافت کی دنیا میں جن لوگوں نے حق گوئی اور بیباکی کا علم بلند رکھا ہے اور اپنے قلم کو اپنی حریتِ فکر کا ترجمان بنایا ہے ان میں رضوان احمد کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے ذہنی جرأت اور آزادیٔ فکر و نظر کا جو معیار سامنے رکھا ہے وہ دوسروں کے لئے مثال کا کام دے سکتا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

رضوان احمد نے جو کچھ لکھا ہے خونِ دل سے لکھا ہے اور جس ملک میں ان کے جیسے باضمیر اور با اُصول صحافی ہوں وہ ملک ساری دنیا کے سامنے سر اونچا کر کے باوقار طریقے سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ میں رضوان احمد کی عظمت کو سلام کرتی ہوں۔

واجدہ تبسّم

Vedic Archives Digital Preservation Foundation, Chandigarh